لکھنؤ

تعمیر حیات

پندرہ روزہ

مجلس صحافت ونشریات دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

جلد نمبر ۲۳ | ۱۰ر جولائی ۱۹۸۶ء مطابق ۳ر ذی قعدہ ۱۴۰۶ھ | شمارہ نمبر ۱۷

نگران اعلیٰ

مولانا ابو العرفان ندوی

مجلس ادارت

شمس الحق ندوی
محمود الأزہار ندوی

خط وکتابت کا پتہ:
منیجر "تعمیر حیات"
پوسٹ بکس نمبر ۹۳
ندوۃ العلماء۔ لکھنؤ۔ انڈیا۔

زر تعاون

سالانہ : تیس روپے
ششماہی : بیس روپے
فی پرچہ : ایک روپیہ ۵۰ پیسے

بیرون ملک

بحری ڈاک، ہمہ ڈاک : ۱۰ ڈالر

فضائی ڈاک

ایشیائی ممالک : ۱۵ ڈالر
افریقی ممالک : ۱۸ ڈالر
یورپ وامریکہ : ۲۰ ڈالر

نوٹ

چیک، ڈرافٹ سکریٹری مجلس صحافت ونشریات لکھنؤ کے نام سے بنائیں اور دفتر تعمیر حیات کے پتہ پر روانہ فرمائیں۔

اس دائرہ میں اگر سرخ نشان ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اس شمارہ پر آپکا چندہ ختم ہو چکا ہے لہٰذا اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ دین وادب کا یہ خادم، ندوۃ العلماء کا ترجمان، آپ کی خدمت میں پہنچتا رہے تو سالانہ چندہ مبلغ تیس روپے ارسال فرمایئے یہ آپ کی ذمہ داری ہے۔ چندہ یا خط بھیجتے وقت اپنا نمبر خریداری لکھنا نہ بھولیں

اداریہ

شمس الحق ندوی

حالات قابو میں ہیں

آئے دن اخبارات میں یہ خبر آتی رہتی ہے بلکہ اب معمول سا بن گیا ہے کہ فلاں جگہ فساد ہو گیا، فلاں جگہ دو فرقوں میں تصادم ہو گیا، فلاں جگہ مذہبی جلوس پر پتھراؤ کے نتیجہ میں کشیدگی ہے، فلاں جگہ عبادت گاہ کی بے حرمتی کی گئی اور اب حالات خراب ہیں وغیرہ وغیرہ، اور اندر تفصیلات ہوتی ہیں کہ اتنی دکانیں نذر آتش کر دی گئیں، اتنے مکانوں کو آگ لگائی گئی اتنے افراد کو چھرا مار دیا گیا۔

اور پھر تحریر ہوتا ہے کہ خبر پاتے ہی متعلقہ افسران موقع پر پہونچ گئے۔ پی، اے، سی نے پوزیشن سنبھال لی اور اب حالات قابو میں ہیں۔ اور پھر حالات کو قابو میں کرنے کے بعد اخباری بیانات کے مطابق کرفیو نافذ کر کے ایک فرقہ پر ظلم وجور کا جو پہاڑ توڑا جاتا ہے اس کو سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ گھر گھر تلاشی جاری ہے کے بہانہ بنا کر ماؤں بہنوں کی جو بے حرمتی کی جاتی ہے اور برسوں کی کمائی کو جس طرح لوٹا جاتا ہے، قیدیوں پر جس بے دردی سے ڈنڈے برسائے جاتے ہیں اور جس طرح ان کو ناکارہ بنا دیا جاتا ہے ناقابل بیان ہے۔

یہ صورت حال ہمارے ملک کے لئے بڑے خطرناک دن کا پتہ دے رہی ہے۔ ظلم بہر حال ظلم ہے جو بھی کرے برا ہے لیکن جب محافظ ظلم کرنے لگیں بے بس عوام پر۔ تو آسمان والے کا فیصلہ جلد آجاتا ہے، اس کی طرف سے مہلت اور ڈھیل دینے کی مدت گھٹ جاتی ہے اور کوئی ایسا خدائی فیصلہ ہو جاتا ہے جس سے ملک برباد ہو جاتا ہے اور ایک سرے سے دوسرے سرے تک دھول اڑنے لگتی ہے۔

شرپسند وفرقہ پرست عناصر نے ملک میں عداوت ونفرت کا بیج بو کر جو ہولی جلائی ہے اور خون کا جو کھیل کھیلا جا رہا ہے وہ ملک کے بڑے بھیانک انجام کا پتہ دے رہا ہے۔ جو گھر جلتا ہے وہ بھارت کی ملکیت ہوتا ہے جو جان جاتی ہے وہ ایک بھارتی کی ہوتی ہے۔ کیا ہمارے ملک کا انٹلی جنس اتنا کمزور ہے کہ اس کو یہ خبر نہیں ہوتی کہ ان سارے فسادات میں کس قسم کی ذہنیت کام کر رہی ہے اور اس کے پیچھے کن لوگوں کا ہاتھ ہے۔ کون سے ناعاقبت اندیش اور مفاد پرست لوگ اس میں شریک ہیں۔ اگر واقعی ایسا ہے تو پھر انٹلی جنس کو ناکامی کا مڈل ملنا چاہئے۔ لیکن واقعہ بظاہر ایسا نہیں معلوم ہوتا۔ حقائق سب عیاں ہیں، مجرمین معلوم ہیں لیکن بعض مفادات کی بنا پر حقائق سے چشم پوشی کی جاتی ہے، اور الزام دوسرے پر ڈال دیا جاتا ہے یا اس کا ذمہ دار کسی خارجی طاقت کو بنایا جاتا ہے حالانکہ دشمن ہمارے اندر ہے۔ عدالتی تحقیقات کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو فوراً کمیشن بٹھا دیا جاتا ہے سب لوگ پڑھتے اور سنتے ہیں کہ کمیشن بٹھا دیا گیا ہمارا انتظامیہ بہت چوکس ہے۔ لیکن آج تک کسی کمیشن نے مجرموں کو سامنے نہیں کیا۔ کسی بھی ملک وقوم کے لئے یہ صورت حال نہایت خطرناک ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا جو ساری دنیا کے لئے رحمت بن کر آئے تھے۔ کہ تم سے پہلے قومیں اس لئے برباد ہوئیں کہ ان میں جب کوئی طاقتور اور معزز جرم کرتا تھا تو چھوڑ دیا جاتا تھا اور جب کمزور جرم کرتا تھا تو اس کو سزا دی جاتی تھی۔ ہمارے ملک میں کچھ ایسے لوگ موجود ہیں جن کی تاریخ پر نظر ہے اور ان کے سامنے یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اس طرح کے حالات ہی تاریخ میں کیسے کیسے انقلابات لائے ہیں حکومتیں، بڑی بڑی حکومتیں حرف غلط کی طرح مٹا دی گئی ہیں کہ انسانوں کے بنانے والے کو انسانوں پر اتنا زیادہ اتیاچار (ظلم) پسند نہیں ہے۔ کہنے والے چلا چلا کر کہہ رہے ہیں کہ اس وقت ملک کی کشتی منجدھار میں ہے اس کی فکر کیجئے۔

ہمارا ملک اس وقت جن حالات سے دوچار ہے وہ یہ بتاتے ہیں کہ انسانیت اور اخلاق کا تصور ذہنوں سے نکلتا جا رہا ہے اور سماج بگاڑ کے اس نقطہ پر پہنچ چکا ہے جہاں یہ کہنا حق بجانب ہو کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ اخبارات قتل، زندہ جلانے، لوٹنے اور سرکشی اور جنسی بے راہ روی کے واقعات سے روزانہ پُر رہتے ہیں۔ یہ خونی ڈرامہ اتنی بار اور اتنے مختلف مقامات پر کھیلا جا رہا ہے کہ

طالبان علوم نبوت سے

مولانا صدیق احمد صاحب باندوی

میرے عزیز بھائیو!

آپ حضرات اچھی طرح جانتے ہیں کہ دنیا میں ہر چیز کے حاصل کرنے کے لئے کچھ ضوابط ہیں، کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو اس شئی کے لئے موقوف علیہ کا درجہ رکھتی ہیں جن کے بغیر اس کا حصول نہیں ہو سکتا۔ ان امور میں اساتذہ کا احترام اولیت کا درجہ رکھتا ہے۔ تمام شرائط موجود ہوں لیکن جس طالب علم کے اندر اس کا فقدان ہے وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

علم حاصل کرو اور علم کے لئے متانت اور وقار پیدا کرو۔ جس سے علم حاصل کرو اس سے خاکساری برتو"

ایک حدیث میں ہے کہ استاد کی عزت کرنا تعظیم خداوندی میں داخل ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ، میں اس کا غلام ہوں جس نے مجھے ایک حرف سکھایا اگر وہ چاہے تو مجھے فروخت کر دے اگر چاہے تو غلام رکھے یا آزاد کر دے۔

میرے بھائیو! حضرت علی رضؓ تو ایک حرف سکھانے والے استاد کو اپنے اوپر ہر طرح کا اختیار دیں خود کو اس کا غلام سمجھیں۔ اور جن اساتذہ سے ہم نے کئی کئی برس میں ہزارہا صفحات کتابوں کے پڑھے ہیں ان کی ایک بات برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں۔ انکی شان میں گستاخیاں کرتے ہیں۔

امام احمد بن حنبل رحؒ ادب کی وجہ سے اپنے استاد کا نام نہ لیتے تھے اور ہم اپنے اساتذہ کی ہجو میں قصیدہ لکھتے ہیں۔ ان کی توہین میں کوئی کسر نہیں باقی رکھتے۔ نشہ میں اس طرح سرشار ہو جاتے ہیں کہ ہم کو اپنے سوء خاتمہ کا بھی اندیشہ نہیں ہوتا۔ حضرت حماد رحؒ امام ابو حنیفہ رحؒ کے استاد ہیں خود حضرت حماد کی ہمشیرہ عاتکہ فرماتی ہیں کہ جس وقت امام ابو حنیفہ رحؒ ہمارے بھائی سے پڑھتے تھے۔ اس زمانے میں ہمارے گھر کا سب کام کرتے تھے حتیٰ کہ ہمارے گھر کی روئی تک دھنتے تھے۔ اسی خدمت نے ان کو امامت کے منصب پر فائز کیا تھا۔ پہلے آدمی کسی کا غلام بنتا ہے پھر دنیا کا امام ہوتا ہے۔

جو طلبہ اپنے استاد کا ادب کرتے ہیں، اس کی خدمت کو سعادت سمجھتے ہیں، اللہ پاک ان کو دینی اور دنیوی عزت سے سرفراز کرتا ہے۔ ایسے ہی طلبہ فراغت کے بعد دین کی اشاعت کرتے ہیں، جن سے ہزاروں بندگان خدا کو ہدایت نصیب ہوتی ہے۔ وہ زمین پر مانند ستاروں کے ہوتے ہیں۔ ان کی صحبت میں ایسی تاثیر ہوتی ہے کہ برسہا برس کا پاپی گناہوں سے توبہ کر کے خداوند تعالیٰ کی معرفت کا نور قلب کے اندر پیدا کرتا ہے، وہ اساطین امت ہوتے ہیں، جن پر آسمان وزمین فخر کرتے ہیں۔ وہ جس زمین پر قدم رکھتے ہیں گمراہی دور ہو جاتی ہے اور ہدایت کی راہیں کھل جاتی ہیں۔

آج بھی اللہ پاک جن حضرات سے دین کی خدمت لے رہا ہے ان کی طالب علمی کا زمانہ اگر دیکھا جائے تو یہ جوہر ان میں نمایاں نظر آئے گا۔ انھوں نے ہمیشہ اپنے استاد کا ادب ملحوظ رکھا ہے۔

حضرت معن ابن عیسیٰ امام مالک رحؒ کے بڑے شاگردوں میں ہیں اپنے زمانہ کے بڑے محقق اور مفتی تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ مقام اپنے استاد کی خدمت سے ملا ہے۔

علامہ انور شاہ کشمیری رحؒ کے ایک بنگالی شاگرد جو اس وقت اپنے علاقہ کے شیخ الاسلام ہیں وہ خود فرماتے ہیں کہ میں نہ تو ذہین تھا اور نہ پڑھنے ہی میں محنت زیادہ کی تھی، البتہ حضرت شاہ صاحب رحؒ کی خدمت کرتا تھا، ان کی دعاؤں کا ثمرہ ہے کہ اللہ پاک نے یہ منصب عطا فرمایا ہے۔

آج اساتذہ کی خدمت تو درکنار خود ان کو مدارس کی خدمت سے علیحدہ کرنے کی اسکیمیں طلبہ بناتے ہیں۔

میرے بھائیو!

آپ کے والدین نے آپ کو مدرسہ میں اس لیے نہیں بھیجا کہ یہاں کے نظم ونسق میں آپ دخیل ہوں۔ آپ یہاں علم دین حاصل کرنے کے لئے آئے ہیں، اس مقصد کو ہر وقت سامنے رکھئے

ایسی کوئی حرکت نہ کیجئے جس سے اس میں رخنہ پڑے، آپ کا وقت بڑا قیمتی ہے اگر اس قسم کے خرافات میں ضائع کیا تو پھر اس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔

میرے بھائیو!

ذرا ماضی پر نگاہ ڈالئے کیا آپ کو ایسے طلبہ کا حال نہیں معلوم جنھوں نے مولی کے پتے کھا کر علم حاصل کیا ہے، رات رات بھر سڑک کی لالٹینوں کی روشنی میں کتابوں کا مطالعہ کیا ہے، سردی کے زمانے میں مسجد کی چٹائیوں میں لپٹ کر رات گذاری ہے۔

زمانہ نے پھر دیکھا کہ ان حضرات نے ایک ایک علاقہ کو سیراب کیا دنیا میں وہ آفتاب اور ماہتاب بن کر چمکے۔ آج دروازہ بند نہیں ہو گیا لیکن اپنے اندر ایسے اوصاف تو پیدا کیے جائیں۔

آج مدارس میں جس قدر آسائش اور راحت کا انتظام کیا جاتا ہے اس پر بجائے شکر کرنے کے اس کی ناقدری کی جاتی ہے۔

غیر سودی بینکنگ

از:۔ سید محی الدین

بین الاقوامی مالیاتی فنڈ (انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ) کے ایک تجزیہ کے مطابق اسلامی اصولوں کے مطابق بینکنگ کے نظام روایتی بینکنگ کے طریقہ کار سے کہیں زیادہ پائیدار اور مستحکم ثابت ہو سکتا ہے۔

بہت سے اسلامی ممالک اپنے معاشی نظام کو بتدریج اسلامی احکام کے مطابق ڈھالتے جا رہے ہیں جو قرض پر سود لینے اور دینے کا سخت مخالف ہے۔

مسٹر محسن۔ ایس خان نے "بلا سودی بینکنگ" کے عنوان سے شائع اپنے ایک جائزہ میں مروجہ روائتی طریقہ بینکنگ اور اسلامی نظام بینکنگ کا مقابلہ کیا ہے انہوں نے بتلایا ہے کہ اگرچہ اسلام سودی کاروبار کو غیر قانونی قرار دیتا ہے، مگر وہ تجارت اور نفع کمانے کے دوسرے طریقوں کی نہ صرف اجازت دیتا ہے بلکہ اسکی ہمت افزائی بھی کرتا ہے۔

مسٹر خان نے اسلامی بینکنگ کے نظام کا ایک خاکہ بھی پیش کیا ہے جسے اکثر اسلامی ممالک میں نافذ کیا جا چکا ہے، اس نظام کے تحت کسی بینک میں روپیہ جمع کرنے والوں کو بینک یا حکومت کی جانب سے یہ ضمانت نہیں دی جاتی کہ انکی جمع شدہ رقم جوں کی توں واپس کی جائے گی اور نہ انہیں اسپر کسی مقررہ شرح سے سود ملتا ہے۔ اسکے بجائے انہیں بینک کے نفع اور نقصان دونوں میں حصہ دار بننا پڑتا ہے۔

مسٹر خان نے بتلایا ہے کہ اس نظام میں اس بات کی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ باہری دباؤ کا مقابلہ کر سکے۔ روائتی بینکوں کے نظام میں یہ باہری دباؤ ان کے نفع کو گھٹانے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ انکے تجزیہ کے مطابق چونکہ اسلامی بینکنگ کے نظام میں نہ تو شرح سود پہلے سے طے شدہ ہوتا ہے اور نہ جمع شدہ رقم کو اتنی مقدار میں واپس کرنے کی ضمانت ہوتی ہے۔ اسلئے بینک کو خسارہ ہونے کی صورت میں اسکی ذمہ داریاں بھی نسبتاً کم ہو جاتی ہیں، جبکہ روائتی بینک کے نظام میں خسارے کی حالت میں بھی بینک کی ذمہ داریاں بدستور باقی رہتی ہیں اور اسکی وجہ سے ایک ایسا عدم توازن پیدا ہو جاتا ہے جو بینک کو کمزور کر دیتا ہے، روائتی بینکنگ کے نظام میں اسکی کوئی گنجائش نہیں ہوتی کہ خسارے کی صورت میں وہ اپنے وسائل اور ذمہ داریوں میں کسی قسم کا توازن پیدا کر سکے اور یہ کمزوری اسکے عدم استحکام کا سبب بن جاتی ہے۔

مسٹر خان نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ بینکنگ کے اسلامی نظام میں ابھی کچھ خامیاں موجود ہیں، لیکن مساویانہ ذمہ داری کا یہ نظام جو اکثر اسلامی ممالک میں نافذ کیا جا چکا ہے معاشی نقطہ نظر سے بہت سی خوبیوں کا حامل ہے۔

(بشکریہ ہندوستان ٹائمس دلی۔ ۱۳ر مئی ۱۹۸۶ء)

ہر پچھلا سین اگلے سین سے کمتر ہو جاتا ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ زیادتی کدھر سے ہو رہی ہے مگر یہ ضرور کہیں گے کہ یہ صورت حال ہمارے ملک اور اہل ملک کے لئے نہایت تشویشناک ہے، حالات قابو میں نہیں بلکہ بالکل بے قابو ہوتے جا رہے ہیں۔ ہم اپنے ہاتھوں اپنے گھروں کو جلا رہے ہیں، اپنی جائدادوں کو مٹا رہے ہیں، اپنی ہی جانوں کو شکاری جانوروں کی طرح، چھری چاقو اور گولیوں کا نشانہ بنا رہے ہیں، قرآن کی تعبیر میں یخربون بیوتہم بأیدیہم وہ اپنے ہاتھوں اپنے گھروں کو اجاڑ رہے ہیں۔ اور یقتل بعضہم بعضا وہ اپنے ہی لوگوں کو قتل کر رہے ہیں۔

اس وقت ہم قرآن کی اس بلیغ تعبیر کا مکمل مصداق بنے ہوئے ہیں۔ ہم زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتے کہ یہ کون کر رہا ہے، حقائق پوشیدہ نہیں ہیں، پریس میں سب کچھ آتا رہتا ہے مگر ان حقائق کی طرف دھیان نہیں دیا جا رہا ہے چند مفاد پرستوں اور فرقہ پروروں کے رحم و کرم پر ملک کی قسمت کو چھوڑ دینا کسی بھی ہوش مند و دانا قوم کا شعار نہیں ہے ملک کے دانشوروں کو قائدین اور سیاسی رہنماؤں کو اس بگڑی ہوئی صورت حال کو سدھارنے کی جلد فکر کرنی چاہئے عوام میں قوم و مذہب کے نام پر انسانیت دشمنی کی ذہنیت کو ختم کر کے انسانیت دوستی کا شعور بیدار کرنا چاہئے ورنہ ملک کو تباہی سے کوئی بچا نہیں سکتا۔

کاش اہلِ ملک اس کو سمجھتے۔

سوال و جواب

محمد طارق ندوی

سوال: جیسا کہ مشہور ہے کہ عقیقہ کا گوشت ماں، باپ، بیٹا، بیٹی، دادا دادی، نانا، نانی نہیں کھا سکتے، کیا شریعت میں اس کی کوئی اصل ہے؟

جواب: یہ بالکل غلط مشہور ہو گیا ہے اس کی شریعت میں کوئی اصل نہیں ہے، عقیقہ کا گوشت مذکورہ اشخاص استعمال کر سکتے ہیں کسی قسم کی کوئی ممانعت نہیں ہے۔

سوال: کیا نماز جنازہ میں فرض و واجب نمازوں کی طرح قیام فرض ہے؟

جواب: ہاں، جس طرح فرض و واجب نمازوں میں قیام فرض ہے اور بلا عذر اس کا ترک کرنا جائز نہیں ہے اسی طرح نماز جنازہ میں بھی قیام فرض ہے۔

سوال: کیا جنازہ کے پیچھے چلنا مستحب ہے؟

جواب: ہاں جنازہ کے پیچھے چلنا مستحب ہے جنازہ کے آگے چلنا بھی جائز ہے، البتہ اگر سب لوگ جنازہ کے آگے ہو جائیں تو مکروہ ہے۔

سوال: کیا میت کو قبر میں رکھتے وقت اذان دینا شرعاً ثابت ہے؟

جواب: نہیں، بلکہ میت کو قبر میں رکھتے وقت اذان دینا بدعت ہے۔

سوال: کیا اگر کوئی نماز وتر میں دعائے قنوت دوسری رکعت میں پڑھ جائے تو کافی ہے؟

جواب: نہیں اگر کوئی پہلی یا دوسری رکعت میں دعائے قنوت پڑھ جائے تو اس کا کچھ اعتبار نہیں ہے تیسری رکعت میں پڑھے اور سجدہ سہو کرے۔

سوال: کسی نے چار رکعت نفل نماز کی نیت باندھی پھر توڑ دی تو اس پر کے رکعتیں واجب ہوں گی؟

جواب: صورت مسئولہ میں صرف دو رکعتیں پڑھنا واجب ہوں گی کیونکہ نفل کی ہر دو رکعت الگ الگ ہوتی ہیں۔

سوال: سنت و نفل کی کسی رکعت میں سورت ملانا بھول جائے تو کیا کرے؟

جواب: صورت مسئولہ میں سجدہ سہو کرے کیونکہ سنت و نفل کی ہر رکعت میں سورۃ ملانا واجب ہے۔

سوال: اگر کوئی شخص نفل نماز میں التحیات کے بعد درود شریف پڑھ جائے تو اس پر سجدہ سہو واجب ہے یا نہیں؟

جواب: صورت مذکورہ میں سجدہ سہو واجب نہیں ہوگا کیونکہ نفل نمازوں میں التحیات کے بعد درود شریف پڑھنا جائز ہے۔

سوال: ہندو اپنے تہواروں میں اپنے مسلم ملنے والوں کی دعوت کرتے ہیں اور ان کو مٹھائی وغیرہ کھلاتے ہیں کیا شرعاً ان کی یہ مٹھائی کھانا درست ہے؟

جواب: کھانا جائز ہے۔

سوال: کیا نماز جنازہ میں تین صفیں کرنا مستحب ہے؟

جواب: ہاں، نماز جنازہ میں تین صفیں کرنا مستحب ہے یہاں تک کہ اگر صرف سات آدمی ہوں تو ایک آدمی ان میں سے امام بنا دیا جائے اور پہلی صف میں تین اور دوسری میں دو، اور تیسری میں ایک آدمی کھڑے ہوں۔

سوال: کیا جنازہ لیجاتے وقت دعا وغیرہ زور سے پڑھی جا سکتی ہے؟

جواب: نہیں، جنازہ لے جاتے وقت زور سے دعا وغیرہ پڑھنا مکروہ ہے۔

سوال: غیر مسلم کی عیادت کرنا جائز ہے یا نہیں۔

جواب: غیر مسلم کی عیادت اور تعزیت جائز ہے۔

سوال: کیا وضو کے بچے ہوئے پانی کو کھڑے ہو کر پینا جائز ہے؟

جواب: وضو کے پانی کو کھڑے ہو کر پینا مستحب ہے۔

سوال: کیا نماز عصر کے بعد قضائے عمری پڑھ سکتے ہیں؟

جواب: ہاں، نماز عصر کے بعد قضائے عمری پڑھ سکتے ہیں، در مختار میں ہے۔

" ولا یکرہ قضاء فائتۃ "

سوال: کیا جمعہ کی نماز کے لئے خطبہ شروع ہونے سے ختم نماز تک کم از کم تین آدمیوں کا رہنا ضروری ہے؟

جواب: ہاں امام کے سوا کم از کم تین آدمیوں کا شروع خطبہ سے نماز ختم ہونے تک موجود رہنا ضروری ہے۔ گو وہ تین آدمی خطبہ کے وقت ہوں اور نماز کے وقت اور مگر اتنا ضروری ہے کہ وہ تین آدمی ایسے ہوں جو امامت کر سکیں۔

سوال: اگر نبی کریم ؐ کا اسم مبارک خطبہ میں آئے تو مقتدی کیا کرے؟

جواب: خاموش رہے زور سے درود نہ پڑھے البتہ دل میں درود شریف پڑھ سکتا ہے۔

جوابی عید کارڈ

گرگٹ گورکھپوری

خط ملا، مضمون خط دیکھا، بس اتنا یاد ہے
کون جانے کب جگر کے پار خنجر ہو گیا

دی ہے یہ کیسی مبارکباد تو نے عید کی
ایک حرفِ شادمانی غم کا دفتر ہو گیا

دل کہ اک مدت سے تھا شہر خموشاں کی طرح
کیا کیا تو نے کہ برپا شورِ محشر ہو گیا

اک شعاعِ نشتر بس اور وہ بھی کتنی دلنواز
نقش اک اک زخم پنہاں کا اجاگر ہو گیا

درد جب سمٹا تو سر تا سر ہوا مستور دل
اور جب پھیلا تو پھر ہندوستاں بھر ہو گیا

بابری مسجد تھی کل تک، آج مندر ہو گیا
کفر کا اب یہ دماغ اللہ اکبر ہو گیا

آ گئی شیر ژیاں میں گوسفندی کس قدر
اور انبوہ شغالاں کیا دلاور ہو گیا

باوجود ان وسعتوں کے اتنی تنگ ارضِ وطن
سانس بھی لینا اب اس مجلس میں دوبھر ہو گیا

گھر جلے، خوں بھی بہا، پونجی بھی عصمت کی لٹی
یہ تو قصہ آئے دن کا اے برادر ہو گیا

لیجئے وہ کھل گئی " فائل " الہ آباد کی
بند یعنی بارہ بنکی کا " رجسٹر " ہو گیا

مقدرت اب اور ہے بھی کیا ہمیں جز احتجاج
ایک اس در کے علاوہ بند ہر در ہو گیا

ہاں مگر یہ سعئ بے حاصل بھی کر کر دیکھ لی
ہو گیا یہ شوق لاطائل بھی اکثر ہو گیا

لاکھ چیخو پھر بھی جیسے کوئی سنتا ہی نہیں
جیسے جیتا جاگتا یہ شہر " پتھر " ہو گیا

پوچھتے ہیں ہم کہ جب ٹوٹے گئے اس پر ستم
نالشِ اہلِ ستم کا کیا پیمبر ہو گیا

اک کرن کی بھیک مانگی بھی ہو اس نے تو کہو
بلکہ ذرہ ذرہ خود اس سے منور ہو گیا

حق تو یہ ہے اب مسلماں حق کی دولت چھوڑ کر
بے محابا کوئے باطل کا گداگر ہو گیا

کیا قیامت ہے کہ ہو وہ خاکِ تیرہ کا غلام
جس کی خاطر عرشِ اعظم تک مسخر ہو گیا

اعلانِ تصحیح

مورخہ ۱۰ر مئی ۱۹۸۶ء میں شب قدر کے عنوان سے جو مضمون مولانا سید سلیمان ندویؒ کا شائع ہوا ہے اس میں سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۴ " آمن الرسول بما انزل علیہ " چھپ گیا ہے جب کہ آیت مذکورہ " بما انزل الیہ " ہے، لہذا آپ اس کی تصحیح فرمائیں۔

امتِ مسلمہ کا کام اور پیغام

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

جن باتوں کی طویل انسانی تاریخ اور علم النفس اور علم الاخلاق پوری تائید کرتے ہیں ان میں سے ایک بات یہ بھی ہے کہ بلند ترین مقاصد، شریفانہ تعلیمات، اور عمل کے اعلا ترین نمونے اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتے اور اگر قائم ہو بھی جائیں تو دائم و باقی نہیں رہ سکتے جب تک کہ ان کی پشت پر ایک انسانی جماعت (بلکہ صحیح الفاظ میں ایک ایسی امت) نہ ہو جو اس دعوت و تحریک کی علمبردار اس کے راستہ میں جہد و جہاد کرنے والی اور اس کا عملی نمونہ ہو۔

اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ بعض انبیاء علیہم السلام (چہ جائیکہ مصلحین و معلمین اخلاق اور حکمائے کبار) کی تعلیمات بھی اس وجہ سے زیادہ عرصہ تک باقی نہیں رہیں کہ ان کے پیچھے کوئی امت نہ تھی، جو ان کے پیغام کی ذمہ داری سنبھالتی اس راستہ میں جاں نثاری کرتی، اور اپنی زندگی، اپنے تمدن اور حکومت و معاشرہ کے ذریعہ ان کا عملی نمونہ پیش کرتی، نتیجہ یہ ہوا کہ جن علاقوں میں وہ بھیجے گئے تھے وہاں کی زندگی ایک ایسے آب رواں کی طرح بن کر رہ گئی جس کی سطح ایک ہوتی ہے، اور وہ اقوام و قبائل جانوروں کے اس ریوڑ کی طرح ہو گئے جن کا کوئی نگراں و نگہبان نہ ہو۔

منتخب و مامور امت!

جب اللہ تعالے نے یہ فیصلہ فرمایا کہ محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم آخری رسول اور خاتم النبیین ہوں، اور آپ کے بعد نہ کوئی اور نبی آئے اور نہ کوئی اور کتاب نازل ہو تو اس طرح اللہ تعالے نے انسانیت کو اس خطرہ سے محفوظ کر دیا اور محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ایک پوری امت کو بھی مبعوث کیا، گویا بعثت محمدیہ دُہری بعثت تھی، جس میں نبی کی بعثت امت کی بعثت کے ساتھ شامل تھی، چنانچہ اللہ تعالے نے اس اُمت کی ایسی تعریف کی ہے (جو نبوت کے بغیر) کسی مبعوث اور مامور من اللہ ہی کی ہو سکتی ہے:-

کُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ	تم لوگ بہترین جماعت ہو جو لوگوں
لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ	کے لئے پیدا کی گئی ہے، تم بھلائی کا
وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ	حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو
بِاللّٰهِ (آل عمران - ۱۱۰)	اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔

دوسری جگہ ارشاد ہوا:-

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا	اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک
لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ	امت عادل بنا دیا ہے تاکہ تم
وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ	گواہ رہو لوگوں پر اور رسول گواہ
شَهِيْدًا (البقرۃ - ۱۴۳)	رہیں تم پر۔

حدیث نبوی میں بھی اسی طرح کے الفاظ آئے ہیں جن میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام ؓ کی ایک جماعت سے فرمایا:-

إِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُيَسِّرِيْنَ وَلَمْ	تم آسانی پیدا کرنے والے بنا کر بھیجے
تُبْعَثُوْا مُعَسِّرِيْنَ [1]	گئے ہو نہ کہ تنگی پیدا کرنے والے۔

بعثت و دعوت کی ذمہ داری اور اپنی ماموریت و مسؤلیت کا یہ شعور و احساس صحابۂ کرام ؓ و تابعین عظام ؒ کے دلوں میں اس وقت بھی موجزن تھا جب ایرانی تائدِ جنگ رستم نے سیدنا ربعی بن عامر ؓ [2] سے (جنھیں سیدنا سعد بن ابی وقاص ؓ نے رستم کی طلب پر اپنا سفیر بنا کر بھیجا تھا) یہ پوچھا کہ تمہارے یہاں آنے کا محرک و مقصد کیا ہے؟ تو انھوں نے یہ مومنانہ اور داعیانہ جواب دیا کہ:-

اللّٰه ابتعثنا لنخرج من شاء من	اللہ تعالے نے ہمیں اس لئے بھیجا ہے کہ
عبادة العباد الى عبادة الله	ہم جس کو وہ چاہے بندوں کی بندگی
وحدہ ومن ضيق الدنيا	سے نکال کر ایک خدا کی بندگی پر آمادہ
الى سعتها ومن جور الأديان	کریں اور دنیا کی تنگی سے اس کی
الى عدل الاسلام [1]	وسعت کی طرف اور مذاہب کے
	ظلم سے بچا کر اسلام کے سایۂ عدل
	میں لائیں۔

تمدن و معاشرہ کی سطح پر صالح انقلاب کی ضرورت!

اس نقطۂ نظر نے انسانیت کے مستقبل کو بےحد متاثر کیا، اور یہ لوگوں کے لئے مذاہب و تحریکات اور رجحانات کی تاریخ میں ایک نئے تجربہ کی حیثیت رکھتا تھا جس نے تاریخ میں ایک انقلاب برپا کر دیا، اس لئے کہ چھٹی صدی مسیحی کی عالمی صورتِ حال (جو تقریباً ہر زمانہ میں رہی ہے) ایسی نہ تھی کہ اس پر چند صالح افراد اثر انداز ہوتے، چنانچہ قرآن مجید خدائی غضب کے شکار یہودیوں کے درمیان بھی کچھ صالح افراد کی موجودگی کی گواہی دیتا ہے۔

لَيْسُوْا سَوَآءً ۭ مِنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ	سب (اہل کتاب) یکساں نہیں
أُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ	(انھیں) اہل کتاب میں ایک جماعت
اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ	قائم ہے یہ لوگ اللہ کی آیتوں کو
يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ	اوقات شب میں پڑھتے ہیں اور
وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ	سجدہ کرتے ہیں یہ اللہ اور قیامت
وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ	کے دن پر ایمان رکھتے ہیں اور
فِي الْخَيْرٰتِ ۭ وَأُولٰٓئِكَ	بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور بدی
مِنَ الصّٰلِحِيْنَ	سے روکتے ہیں اور اچھی باتوں کی
(آل عمران - ۱۱۳، ۱۱۴)	طرف دوڑتے ہیں یہی لوگ نیکوکاروں
	میں سے ہیں۔

مگر ان صالح افراد کا انسانی معاشرہ اور انسانی عمل پر کوئی اثر نہ تھا کیونکہ وہ صرف چند افراد تھے اور قومیں افراد کو خاطر میں نہیں لاتیں چنانچہ ہر دور و دیار میں ایسے صالح افراد رہے ہیں اور اب بھی ہیں جو اپنے کچھ اعمال و اخلاق اور عبادات میں دوسرے لوگوں سے ممتاز ہوتے ہیں لیکن جو خلاء اور مسئلہ قوموں اور نسلوں اور تمدن و معاشرہ کی سطح پر ہو وہ اس وقت تک پُر نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ خیر و صلاح اسوۂ حسنہ اور عملی نمونہ بھی اُمت اور انسانی معاشرے کی سطح کا نہ ہو جو بلند ترین نبوی تعلیمات، شریفانہ اصول و اخلاق، اور مثالی انفرادی و اجتماعی عمل کی نمائندگی حکومت و سیاست، تجارت و معاملت انفرادی و اجتماعی زندگی، افراد اور جماعتوں کے ساتھ برتاؤ اور قوموں اور حکومتوں کے ساتھ معاملات رضامندی و ناراضگی، صلح و جنگ، فقر و غنا، ہر حالت اور ہر صورت میں کرتا ہو اور اس امت و جماعت کی عام علامت اور ممتاز خصوصیت نہ بن چکا ہو۔

صحابۂ کرام ؓ اور وہ مبارک لوگ جنھوں نے گہوارۂ نبوت میں پرورش اور مدرسۂ ایمان و قرآن میں تربیت پائی تھی، انھی مذکورہ علامات و خصوصیات کے مالک تھے۔

ایک انصاف پسند اور تاریخ عالم سے واقف مغربی اہلِ علم نے اس طبقہ کی بڑی کامیاب تصویر پیش کی ہے اور ان کی نمایاں و مشترک خصوصیت کی طرف اشارہ کیا ہے جو نبوت کا باغِ تازہ، اور قرآن کی فصلِ بہار کہلانے کا مستحق ہے جرمن فاضل کائتانی (CAETANI) اپنی کتاب "سنینِ اسلام" میں لکھتا ہے:-

"یہ لوگ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اخلاقی وراثت کے سچے نمائندے مستقبل میں اسلام کے مبلغ، اور محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خدا رسیدہ لوگوں تک جو تعلیمات پہنچائی تھیں ان کے امین تھے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی مسلسل قربت اور ان سے محبت نے ان لوگوں کو فکر و جذبات کے ایک ایسے عالم میں پہونچا دیا تھا، جس سے اعلیٰ اور متمدن ماحول کسی نے دیکھا نہیں تھا۔

درحقیقت ان لوگوں میں ہر لحاظ سے بہترین تغیر ہوا تھا اور بعد میں انھوں نے جنگ کے مواقع پر مشکل ترین حالات میں اس بات کی شہادت پیش کی کہ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کے افکار کی تخم ریزی زرخیز زمین میں کی گئی تھی جس سے بہترین صلاحیتوں کے انسان وجود میں آئے یہ لوگ مقدس صحیفہ کے امین اور اس کے حافظ تھے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے جو لفظ یا حکم انھیں پہنچا تھا، اس کے زبردست محافظ تھے۔

یہ تھے اسلام کے قابلِ احترام پیشرو جنھوں نے مسلم سوسائٹی کے اولین فقہاء، علماء اور محدثین کو جنم دیا" [1]

احتساب کائنات!

اُمتِ اسلامیہ پر عالمی نگرانی اخلاق و رجحانات، انفرادی و بین الاقوامی طرزِ عمل کے احتساب، انصاف کے قیام، شہادت حق، امر معروف و نہی منکر کی ذمہ داری ڈالی گئی ہے اور اس کو قیامت کے دن اس ذمہ داری کی ادائیگی میں کوتاہی پر جواب دہ بنایا گیا ہے:-

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا	اے ایمان والو اللہ کے لئے پوری
قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ	پابندی کرنے والے اور عدل کے
بِالْقِسْطِ ۡ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ	ساتھ شہادت دینے والے رہو اور
شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓي اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ	کسی جماعت کی دشمنی تمہیں اس پر
اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ	نہ آمادہ کرے کہ تم (اس کے ساتھ)
اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ	انصاف ہی نہ کرو انصاف
اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ	کرتے رہو (کہ) وہ تقوی سے
(المائدہ - ۸)	بہت قریب ہے اور اللہ سے
	ڈرتے رہو بے شک اللہ کو اس کی
	(پوری) خبر ہے کہ تم کیا کرتے
	رہتے ہو۔

اور اس امت کو اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی پر تنبیہ کی گئی ہے جس کے نتیجے میں انسانیت مصیبت و مشکل میں پھنس سکتی ہے ——— اور روئے زمین پر فتنہ و فساد اور انارکی پھیل سکتی ہے، چنانچہ اس چھوٹے سے انسانی مجموعہ کو (جو مدینہ کی ابتدائی زندگی میں تھا اور جس کی تعداد چند سو سے زائد نہیں تھی) مخاطب کرتے ہوئے اور اسے دعوت و عقیدہ کی بنیاد پر اسلامی اخوت قائم کرنے کی تاکید کرتے ہوئے فرمایا گیا:-

اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ	اگر یہ نہ کروگے تو زمین میں (بڑا)
فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ	فتنہ اور بڑا فساد پھیل
(الانفال - ۷۳)	جائے گا۔

[1] CAETANI ANNALI DEL' ISLAM. VOL. II. p. 429 ماخوذ از
T. W. ARNOLD PREACHING OF ISLAM. (LONDON 1935) pp. 41-42

[1] البدایۃ والنہایۃ ۷/۳۹

[1] صحیح بخاری [2] آپ صحابیٔ رسول صلے اللہ علیہ وسلم تھے ملاحظہ ہو الاصابہ ۱/۵۰۳

پھر کیا آج کی ملت اسلامیہ اس کی مخاطب نہیں، جس سے معمورۂ عالم آباد ہے، اور جو بڑی بڑی حکومتیں اور افرادی طاقت رکھتی ہے؟ جب وہ اپنے قائدانہ و داعیانہ منصب و مقام کو خالی چھوڑ دے گی اور اپنی اجتماعی ذمہ داری (اخلاقی نگرانی اور رجحانات کے احتساب مظلوم کی حمایت اور ظالم کی مذمت و سرزنش) سے منہ موڑ لے گی تو دنیا پر اس بڑی کوتاہی اور خطرناک غلطی کا کیسا بُرا اثر پڑے گا۔

قرآن اس اُمت کو اس کے داعیانہ و قائدانہ مقام، اصلاح کی ذمہ داری اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی مسؤلیت کی یاد گذشتہ اقوام کا حوالہ دیتے ہوئے اور اس کے شعور و احساس کو بیدار کرتے ہوئے دلاتا ہے:۔

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُونِ	پس کاش تمہارے پیشتر کی امتوں
مِن قَبْلِكُمْ أُولُو بَقِيَّةٍ يَنْهَوْنَ	سے ایسے باشعور لوگ ہوتے جو
عَنِ الْفَسَادِ فِي الْأَرْضِ إِلَّا	منع کرتے ملک میں فساد (پھیلانے)
قَلِيلًا مِّمَّنْ أَنجَيْنَا مِنْهُمْ ۗ	سے بجز چند لوگوں کے جن کو
وَاتَّبَعَ الَّذِينَ ظَلَمُوا مَا أُتْرِفُوا	ہم نے ان میں سے بچا لیا تھا اور
فِيهِ وَكَانُوا مُجْرِمِينَ ۝	جو لوگ (اپنی جانوں پر) ظلم کرنے
(ہود-١١٦)	والے تھے، وہ جس ناز و نعمت میں تھے
	اسی کے پیچھے پڑے رہے اور (عادی)
	مجرم ہو گئے۔

شاعر اسلام ڈاکٹر محمد اقبال نے اس حقیقت کو اپنی نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ"[1] میں بڑی خوبی سے پیش کیا ہے، اور صدر مجلس ابلیس کی زبان سے اس خطرہ کی نشان دہی کی ہے، جو مسلمانوں کے وجود ان کی بیداری اور ان کی عالمی ذمہ داری سے ابلیسی نظام کو لاحق ہے، چنانچہ ابلیس اپنے مشیروں سے کہتا ہے ؎

توڑ ڈالیں جس کی تکبیریں طلسم شش جہات
ہو نہ روشن اس خدا اندیش کی تاریک رات

تم اسے بیگانہ رکھو عالم کردار سے
تا بساط زندگی پر اس کے سب مہرے ہوں مات

خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام
چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات

ہے وہی شعر و تصوف اس کے حق میں خوب تر
جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات

ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتساب کائنات

اُمت کی مسلسل ذمہ داری و نگرانی!

اس نقطۂ نظر سے یہ بات لازمی ہو جاتی ہے کہ انسانی تمدن میں تاثیری عمل جاری رہے اور وقفہ وقفہ سے اس کا از سر نو جائزہ لیا جاتا رہے اور تخریبی اور شر پسند عناصر اور فاسد و مہلک رجحانات سے برابر اس کی حفاظت کی جاتی رہے۔

[1] ارمغانِ حجاز۔

اس کے خاص طور پر دو سبب ہیں، ایک تو یہ کہ اقوام عالم صلاح و فساد کے نئے اور متضاد عناصر کے تابع اور ان سے متاثر ہوتی رہتی ہیں، اور زندگی ہر دم رواں دواں ہے، اور اس کا کارواں کہیں اور کبھی ٹھہرتا نہیں، اس لئے تھوڑے تھوڑے وقفہ سے اس کی سمت و رفتار کو دیکھتے رہنا اور اس کی نئی ضرورتوں کو پورا کرنا ناگزیر ہوتا ہے، افسوس کا مقام ہے کہ اس عہد اخیر میں تخریبی و مفسد تحریکوں اور فلسفوں کے زیر اثر آکر ملتِ اسلامیہ، عالمی قیادت کے میدان سے الگ ہو کر گویا اپنے خول میں بند ہو کر رہ گئی ہے!

دوسرا سبب یہ ہے کہ اُمت اسلامیہ ہی آخری آسمانی پیغام کی حامل ایک ابدی اُمت اور انسانیت کی مرکز امید ہے، اس لئے اسے اپنے پیغام کو سینے سے لگائے رہنا چاہئے، اور قافلۂ انسانیت کی قیادت اور دنیا کی نگرانی اور عقائد و اخلاق، اور انفرادی و بین الاقوامی تعلقات پر نظر رکھنی چاہئے، اس لئے کہ قومیں صرف تاریخ کے سہارے یا اپنی عظمتِ رفتہ اور گذشتہ کامرانیوں کی بدولت نہیں، بلکہ جہد مسلسل، دائمی سرگرمی مستقل احساس ذمہ داری، ہمہ دم قربانی کے لئے آمادگی، جدّت و ندرت، اور اپنی تازہ دم اور تازہ کار قوتِ افادیت و صلاحیت کے بل پر زندہ و تابندہ رہتی ہیں، وہ جب اپنے منصب و مقام کو چھوڑ کر گوشۂ عافیت میں چلی جاتی ہیں تو تاریخ کے دفتر پارینہ کا حصہ بن جاتی ہیں، اور زمانہ انھیں طاق نسیاں پر رکھ دیتا ہے، اس لئے اُمتِ محمدیہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ از سر نو اپنے دعوتی، تہذیبی اور قائدانہ کردار کے ساتھ سرگرم سفر ہو۔

بقیہ ص ٧ کا

طالبعلموں میں سے اگر چند ایسے تربیت یافتہ نکل بھی آئے تو اس سے صورتحال میں کیا تغیر ہوگا؟ اس کے جواب میں عرض یہ ہے کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمیں اپنے تمام مدرسوں اور کالجوں میں اس کی طرف توجہ کرنی چاہئے تاکہ اس کے اثرات وسیع اور عمومی پیمانہ پر ظاہر ہو سکیں، دوسری چیز یہ کہ افراد کی کمی کوئی چیز نہیں بعض وقت ایک فرد پوری پوری جماعت پر بھاری ہوتا ہے یہ فرد جو ایک ذمہ دار انسان کی حیثیت سے اس ادارے سے نکلے گا جس شعبے میں بھی جائے گا اپنے تاثرات چھوڑے گا محض اپنی اس مشق اور تربیت یعنی فرض شناسی اور احساس ذمہ داری اور جذبۂ اسپرٹ کی بدولت تنہا وہ کام زیادہ بہتر طریقہ پر انجام دے سکے گا، جو بہت سے لوگ مل کر بھی اچھے طریقہ پر انجام نہیں دے سکتے اس پر اعتماد ممکن ہوگا وہ اپنے وقت کی قدر کرے گا اور اس کو صحیح طریقہ پر استعمال کرنے کا عادی ہوگا اس لئے اس کو بڑے بڑے کام میں شاید ہی پیش آئیگی اب اگر کوئی ادارہ اس قسم کے افراد پیدا کر سکتا ہے تو خواہ ان کی تعداد بہت کم ہو ان کی افادیت میں کلام نہیں ہو سکتا، اس کے علاوہ اس کام میں متعدد فوائد ہیں جب یہ معلوم ہوگا کہ یہ نوجوان فلاں ادارہ کا سند یافتہ ہے تو ہر شعبہ میں قدرتی طور پر اس کو ترجیح دیجائیگی اور مدارس اور اسکولوں سے نکلنے والے طلبہ یہ محسوس کرنے لگیں گے کہ مزید ایک سال کا کورس پورا کر کے وہ نہ صرف اپنی اہمیت و قیمت بڑھا سکتے ہیں بلکہ کسی خاص شعبہ میں اپنی توجہ مرکوز کر کے اس میں امتیاز بھی پیدا کر سکتے ہیں یہ طلبہ سخت جانچ کے بعد لئے جائیں گے اس لئے ان کا منتخب ترین حصہ یہاں پہونچے گا اور سال بھر کی مشق اور خصوصی درس و مطالعہ کے بعد ان کی بہترین صلاحیتیں بروئے کار آجائیں گی اس میں سب سے اہم اور نازک مسئلہ لائق مدرسین کی فراہمی ہے جو اس اہم اور نازک کام سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت رکھتے ہوں اور تربیت یافتہ ہوں ہمیں اعتراف کے ساتھ کہنا پڑے گا کہ یہ سب سے بڑا دردِ سر ہے تاہم ہم امید کر سکتے ہیں کہ ہندوستان کی ملت اسلامیہ میں ایسے لوگ نایاب نہیں ہیں جو اس کے اہل ہوں اور اس معیار پر پورے اتریں اس کے علاوہ ایسے منتخب طلبہ کی تعداد چونکہ خود کم ہوگی اس لئے اساتذہ کی بھی زیادہ بڑی تعداد کی ضرورت نہ ہوگی،

بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت:

ہمیں اس کام کو جہاں تک ہو سکے جلد شروع کر دینا چاہئے اور اپنے مدرسوں اور اسکولوں میں ایک ایسی فضا پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہئے جس میں زندگی کے سوتے خشک نہ ہوں ان کو ابلنے اور جوش مارنے کا موقع ملے جہاں کے نوجوانوں کی زندگی اور احساس فرض ان کی مشغولیات اور نظام الاوقات، ان کی معاشرت اور شب و روز ان کا ایفائے وعدہ سچائی، جذبۂ خدمت اور اتحاد و اخوت اور جذبۂ ایمانی اور شعور فکر و نظر اس عظیم پیغام کے ساتھ ہم آہنگ ہو یا کم از کم اس کے حق میں ذلت آمیز نہ ہو جس کے لئے یہ امت اس دنیا میں پیدا کی گئی ہے۔

عملی زندگی کا فساد عملی زندگی ہی سے دور ہوگا:

اس کے لئے بہرحال چاق و چوبند اور منظم زندگی کی ضرورت ہے اور بہترین مشاغل کی بھی، مدارس میں اس کا بندوبست ایسے حیرت انگیز نتائج پیدا کر سکتا ہے جس کا اندازہ بھی اس وقت ہمارے لئے مشکل ہے اگر ہمیں اپنے بلند مقاصد، نصب العین اور اپنی دعوت عزیز ہے تو ہمیں اپنے نوجوانوں کے لئے بہتر زندگی، بہتر نظام الاوقات اور بہتر مشاغل کا انتظام کرنا چاہئے اور یہ یقین کرنا چاہئے کہ جب تک یہ عملی انتظامات نہ کئے جائیں گے خالی تعلیم، ضابطہ کی خانہ پری یا محض تنبیہ و سزا اس کے لئے ہرگز کافی نہیں ہو گی یہ عملی زندگی کا فساد ہے اور عملی زندگی ہی سے دور ہو سکتا ہے

فضا کی تبدیلی میں احکام شرعیہ کی تاثیر:

ایک اہم چیز اور ہے جس کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے اور وہ یہ کہ فضا کی تبدیلی اور بہتر اثرات اور نتائج پیدا کرنے میں شریعت کی بعض اہم تعلیمات کی بجا آوری اور احکام کی تنفیذ میں بجائے خود بڑی عجیب و غریب تاثیر ہے ان احکام و تعلیمات میں حق کے سامنے کسی کی رو رعایت نہ کرنا اور ذاتی تعلقات کی بنا پر کسی حکم کی تعمیل میں سستی نہ کرنا خواہ اس میں خود اپنا نقصان ہو رہا ہو ایک بڑا اہم شعبہ ہے اگر مدارس کے ذمہ دار و منتظمین اور ارباب حل و عقد کم از کم اس ایک شعبہ میں جرأت اور سچائی کا مظاہرہ کریں تو اس سے اپنی فضا پیدا ہونے میں خود بخود مدد ملے گی اور یہ دشوار گذار کام آسان ہوتا چلا جائے گا اس سے میری مراد کوئی بڑی قربانی اور نفس کشی نہیں بلکہ حق و صداقت کے ان عام اور بنیادی اصولوں کی رعایت ملحوظ رکھنا ہے جو ہر مومن کا پہلا وصف ہے اور جس کی تکمیل کے بغیر علم و منطق کی موشگافیاں اور یہ ساری سندیں اور ڈگریاں بے کار اور خدا کی نظر میں حقیر و بے قیمت ہیں خدا کرے یہ چند ٹوٹی پھوٹی سطریں اس بات کا داعیہ پیدا کرنے میں کامیاب ہوں اور اس مبارک کام کا آغاز ہو جس کے نہ ہونے سے ہمارے پورے نظام زندگی میں ایک بڑا خلا پیدا ہو چکا ہے اور قحط الرجال کی کیفیت خطرناک تیز رفتاری کے ساتھ بڑھتی جا رہی ہے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کا سفر ترکی

رابطۂ ادب اسلامی کے مشاورتی جلسہ میں شرکت کی دعوت پر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ٨ / جون کو ترکی کے لئے روانہ ہوئے۔ مولانا مدظلہٗ کے رفیق سفر مولانا کے بھانجے مولانا سید محمد رابع ندوی صدر شعبۂ ادب عربی ندوۃ العلماء تھے، مولانا مدظلہٗ کا یہ سفر دو ہفتہ کا تھا، نہایت مفید و بامقصد جلسے ہوئے، انشاء اللہ سفر کے تاثرات مولانا محمد رابع ندوی کے قلم سے قارئین تعمیر حیات ملاحظہ فرمائیں گے۔ مولانا مدظلہٗ ٢٣ / جون کو بعافیت واپس تشریف لائے۔

متعنا اللہ بطول حیاتہ

نظام تعلیم کا ایک بہت بڑا خلا

جس کو جلد پر کرنے کی ضرورت ہے۔

مولانا سید محمد الحسنی رح

مشاطہ را بگو کہ براسباب حسن یار
چیزے فزوں کند کہ تماشا بما رسید

ایک اہم سوال:۔

ہمارے سامنے اس وقت تعلیم کے جو پیچیدہ مسائل ہیں ان میں ایک بڑا اور قابل توجہ مسئلہ یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی میں وہ نظم و ضبط وہ سلیقہ وہ اسپرٹ اور وہ احساس ذمہ داری کیسے پیدا کریں جس کے بغیر ہم زندگی کے کسی شعبہ اور کسی میدان عمل میں کامیاب نہیں ہو سکتے،

ہمارے مدرسوں اور کالجوں سے نکلنے والے طلبہ میں ایک بڑی تعداد ان کی ہوتی ہے جو سند اور ڈگری تو ضرور رکھتے ہیں، لیکن ایفاء وعدہ، خدمت خلق، جذبۂ انسانیت، اتحاد عمل، احساس ذمہ داری، دیانت و امانت اور وقت کے قیمتی ہونے کا احساس اور ملت کی خدمت کا جذبہ اور حوصلہ جیسے اوصاف ان میں بہت کم پائے جاتے ہیں، یہ وہ قدر مشترک ہے جو انگریزی تعلیم یافتہ اور عربی مدارس کے طلبہ و فضلاء سب میں نظر آتی ہے اور اس کا شکوہ ہر جگہ عام ہے۔

اس صورتحال کا ذمہ دار کون ہے؟ اور اس کے اسباب کیا ہیں؟ اس کے لئے ہمیں زیادہ بحث و جستجو کی ضرورت نہیں اس لئے کہ یہ اسباب اس قدر کھلے ہوئے اور واضح ہیں کہ شاید کسی کو اس میں اختلاف کی ضرورت پیش نہ آئے۔

مغربی طرز فکر کے نقصانات

اس صورتحال کی ذمہ داری سب سے پہلے اس طرز فکر پر ہے جو یورپ کے دوسرے مفاسد کے ساتھ اہل مشرق تک پہنچا ہے یورپ نے اپنی تجارتی مصنوعات و برآمدات کے ساتھ جو مخصوص افکار و خیالات ہمارے پاس بھیجے ہیں اور ہم نے ان کو بے زبان اور معصوم سامان تجارت کی طرح بے ضرر اور نفع بخش سمجھ کر قبول کیا ان میں اور چیزوں کے سوا جن کی تفصیل کی یہاں ضرورت نہیں، ایک چیز دین و سیاست کی تفریق دوسری چیز علم برائے علم کا نظریہ ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ تعلیم نے تمام اخلاقی اصولوں اصلی مقاصد کی جگہ گھیر لی ہے اور زندگی کو ایک خاص سانچہ میں ڈھالنے کا کام جس کو ہم تربیت یا تعمیر شخصیت سے تعبیر کرتے ہیں بہت سست پڑ گیا ہے اور بعض جگہ بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے اگر ہمارے نوجوانوں کو ان اعلیٰ مقاصد کی عملی مشق کا بھی موقع اسی اہتمام سے فراہم کیا جاتا جس اہتمام سے ان کے نظام تعلیم اور نصاب تعلیم کی طرف توجہ کی جاتی ہے تو شاید آج صورتحال مختلف ہوتی اور بہت سے وہ مسائل سرے سے پیدا ہی نہ ہوتے جو آج ہمارے لئے الجھن کا باعث ہیں اور ان کے کڑوے پھل ہم کو کھانے پڑ رہے ہیں۔

خلا کیسے پر کیا جائے؟

لیکن سوال یہ ہے کہ اس خلا کو آخر کس طرح پر کیا جائے، جب ہم اپنے مدرسوں اور کالجوں پر نظر ڈالتے ہیں اور اس خاص سطح کو دیکھتے ہیں جس سے بلند سطح کا تصور بھی ان تعلیم گاہوں میں دشوار ہوتا جا رہا ہے تو ہمیں یقیناً مایوسی ہوتی ہے، لیکن اگر ہم زیادہ گہرائی کے ساتھ دیکھیں تو نظر آئے گا کہ مسئلہ اتنا دشوار ہرگز نہیں جتنا سمجھ لیا گیا ہے۔ آج بھی اگر صرف دو تین چیزوں کی طرف توجہ کر لی جائے تو یہ مسئلہ بڑی حد تک قابو میں آسکتا ہے، اس کے لئے ہمیں دو محاذوں کی طرف خصوصی توجہ کرنی چاہئے ایک خود ان مدرسوں اور کالجوں میں، دوسرے ان مدارس سے نکلنے کے بعد۔

نظام الاوقات اور بہتر مشاغل:۔

مکاتب، مدارس اسکول اور کالجوں کی حد تک اگر دو چیزوں کی طرف توجہ دی جائے تو ان شاء اللہ صورتحال میں بڑا تغیر واقع ہو سکتا ہے

پہلی چیز — نظام الاوقات، دوسری چیز تعلیم کے ساتھ مفید اور تعمیری مشاغل کی فراہمی ہے اور یہ دو ایسی چیزیں ہیں جن کا انتظام ہر مدرسہ اور کالج میں ممکن ہے اور اگر صرف ان دو چیزوں کا صحیح طریقہ پر بندوبست کر لیا جائے تو محتاط اندازہ کے مطابق کم از کم ٥٠ فی صد خرابیاں اس سے انشاء اللہ دور ہو جائیں گی اس کی وجہ کھلی ہوئی ہے، بے مقصد وقت گذاری اور ان مفید تعمیری دلچسپ علمی مشاغل کا فقدان (جن کے ذریعہ ان نوجوانوں کے جوش عمل، مہم جوئی اور ذوق جستجو کے جذبات کی تسکین ہو سکے) ان کی شخصیت کو صرف متناسب نشو و نما ہی سے نہیں روکتا بلکہ ان کے حق میں زہر قاتل ہے یہ ان کو غلط راستوں پر ڈالتا ہے ان کو خود سری تذبذب، بے اعتمادی اور پست نگاہی میں مبتلا کر دیتا ہے اس وقت ان کو وعظ و نصیحت اور تنبیہ و سزا کی نہیں ایسے مشاغل کی ضرورت ہوتی ہے جو ان کے جذبات اور صلاحیتوں کو دوسری طرف موڑ سکیں اس کے علاوہ ان کے اوقات کو اس طرح گھیر دے کہ اس میں غلط رجحانات اور مریضانہ و جارحانہ ذہن اختیار کرنے کی گنجائش ہی باقی نہ رہ جائے

نظام الاوقات کا مطلب یہ نہیں کہ ان کو مجبور و مطیع بنا کر رکھا جائے یا اس کی وجہ سے تعلیم کا حرج کیا جائے بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعہ ان کو مرتب زندگی گذارنے کی مشق ہو اپنے وقت کے قیمتی ہونے کا احساس ہو، علم کی غذا کے ساتھ ان کے صحتمند جذبات نیز جسمانی و دماغی صلاحیتوں کو بھی جلا ملے، اور دوسری طرف ان کا وقت ضائع ہونے سے بچے جو صرف ضائع ہی نہیں ہوتا بلکہ ان کی شخصیت کو نقصان بھی پہونچاتا ہے، یہ نظام الاوقات کس طرح کا ہو؟ اور یہ مشاغل کیا ہوں؟ اس کا بہتر فیصلہ خود ان مدارس اور اسکول و کالج کے ذمہ دار حضرات اپنے ہاں کے حالات کو سامنے رکھ کر کر سکتے ہیں اس سلسلہ میں مزید تفصیلات پیش کی جا سکتی ہیں لیکن اب ہم اس دوسرے میدان یا محاذ کی طرف آتے ہیں جو مدارس کے اس پروگرام کے ساتھ مل کر اور زیادہ مؤثر اور مفید ثابت ہو سکتا ہے، دشوار دنیا میں کوئی چیز نہیں ہوتی لیکن اگر یہ میدان بھی ہم سر کر لیں تو اس کے ذریعہ بہت سے ایسے عالی ہمت اور ذی استعداد نوجوان اور جوہر قابل ہمارے ہاتھ لگیں گے جو محض مناسب آب و ہوا زرخیز مٹی اور وافر پانی نہ ہونے کی وجہ سے خاک میں مل جاتے ہیں اور ان کی صلاحیتیں ان کے کام آتی ہیں نہ ملت کے۔

سخت عملی و تربیتی کورس:۔

یہ میدان ایک ایسے تربیتی ادارہ کا قیام ہے جس میں صرف ایک سال رہ کر طالبعلم ان خامیوں کی کسی نہ کسی حد تک تلافی کر سکے جو اس کے مدرسہ یا اسکول و کالج کے زمانہ قیام یا دوران تعلیم میں دور نہ ہو سکی تھیں، یہ ایک سخت قسم کا نظری و عملی کورس ہو جس کو ان شبہ بنانے کے لئے ہم P.M.T. یا I.A.S. کے امتحانات سے دے سکتے ہیں۔

منظم اور چاق و چوبند زندگی:۔

اس میں بنیادی طور پر سب سے زیادہ زور ان ہی دو چیزوں پر دینا ہوگا یعنی منظم نظام الاوقات اور چاق و چوبند زندگی اور بہترین مشاغل و مصروفیات لیکن ان دو چیزوں کے ساتھ ہمیں ایک چیز کا اور اضافہ کرنا چاہئے اور وہ ہے تعلیم، اس اضافہ کے ساتھ ہم اس کو اپنے اعلیٰ مقاصد کے لئے پہلے سے کہیں زیادہ بہتر اور مؤثر بنا سکتے ہیں اس کا مقصد ایک طرف یہ ہے کہ اس کورس کو پورا کرنے والا صرف لیاقت (Good Conduct) اور حسن عمل کی سند لے کر نہ نکلے بلکہ علم و ہنر کے اعتبار سے بھی وہ پہلے سے سوا ہو دوسری طرف یہ کہ وہ بعض ان شعبوں میں خصوصی امتیاز پیدا کر سکے جن کی اس وقت بہت ضرورت ہے۔ مثلاً اسلامیات کے بعض اہم پہلوؤں پر تحقیق و مطالعہ تصنیف و تالیف اور صحافت وغیرہ۔

اس قسم کے کسی ادارہ کا اصل مقصد تربیت ہی رہنا چاہئے جس میں ان کو احساس ذمہ داری، وقت کے قیمتی ہونے کا شعور، اتحاد عمل، جذبۂ انسانیت، خدمت خلق اور دیانت و امانت جیسی چیزوں کی عملی مشق اس طرح شب و روز کرائی جائے جس طرح کوئی فوجی تربیت یا کسی بڑے امتحان کی تیاری ہوتی ہے جو نظری Theoretical بھی ہو اور عملی Practical بھی ہو اس کے ساتھ بہت سی ایسی مصروفیات اور مشاغل ہوں جو ان کے قلب و روح، ذہن و دماغ، اور جسم و جذبات سب کو صحتمند رکھ سکیں اور تفریح و تازگی طبع Refreshment کا بھی ذریعہ ہوں۔

خصوصی مطالعہ:

جہاں تک علم و ہنر کا تعلق ہے اس میں اولیت طالب علم کے ذوق کو ملنی چاہئے۔ بہتر یہ ہے کہ جس چیز سے اپنے دوران تعلیم میں اس کو زیادہ مناسبت رہ چکی ہے وہ اسی میں آگے بڑھے اور ایک سال تک اس پر مزید درس و مطالعہ کے بعد اس میں زیادہ کمال پیدا کرے اور جب واپس آجائے تو اس کے ہاتھ میں نہ صرف احساس ذمہ داری فرض شناسی، اور اخلاق و دیانت کی سند ہو بلکہ اس خاص موضوع پر امتیاز علمی کی شہادت بھی وہ رکھتا ہو۔

زندگی کا نیا سانچہ:

ایک سال تک اس کورس کو پورا کرنے کے بعد ایک نوجوان طالب علم (جس میں بہت کچھ بننے بگڑنے کی صلاحیت ہوتی ہے) اس کے اندر اس درجہ خود اعتمادی، خود شناسی، احساس ذمہ داری، اور قوت عمل پیدا ہو جانا لازمی ہے جس میں اپنے معاصروں اور ہمعصروں سے وہ بدرجہا فائق ہو اس کے علاوہ یہ جوہر ذاتی وہ چیز ہے جس کی جگہ ہر دل اور ہر محفل میں ہے۔

"کب کمال کس کو عزیز جہاں شوی"

ایک ایسی حقیقت ہے جس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں یا اعتراف کیا جا سکتا ہے کہ ان افراد [illegible]

بابری مسجد کا مسئلہ بھی لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی کا ایک نمونہ ہے

جناب سید صباح الدین عبدالرحمنؒ

اتر پردیش میں بابری مسجد کا تنازعہ جاری ہے، اس کی واگذشت کے لیے مسلمانوں نے ۳۰ر اپریل کو بڑے پیمانے پر اپنے گرفتاریوں کے لئے پیش کیا۔ اس سلسلہ میں بارہ بنکی میں گولیاں بھی چلیں، جہاں سرکاری رپورٹ کے مطابق پندرہ آدمی جاں بحق ہوئے، جو بڑا ہی دردناک واقعہ ہے۔

یہ راقم پہلے کی طرح پھر لکھتا ہے کہ اگر مستند معاصر ماخذوں سے یہ ثابت کر دیا جائے کہ..... بابری مسجد رام جنم بھومی کو منہدم کر کے بنائی گئی تو پھر مسلمانوں کو یہ مسجد خود مسمار کر دینا چاہیے۔ مگر کوئی مورخ یہ ثابت نہیں کر سکتا، بعض حلقوں میں یہ دعویٰ کیا گیا کہ بابر کی تزک میں رام جنم بھومی کے انہدام کا ذکر ہے، لیکن پورے وثوق کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں ایسا کوئی ذکر نہیں۔ خیال تھا کہ اس کے انگریزی ترجمہ بابرنامہ میں مسز اے ایس بیورج نے بھی اپنے تعلیقات میں اس انہدام کا ذکر نہیں کیا ہے۔ مگر اس کے مزید مطالعہ سے معلوم ہوا کہ بابر کی تزک میں تو نہیں مگر مسز بیورج نے اپنے حواشی میں نظر سے چوک جانے والے خفی حروف میں اپنی طرف سے دو جگہوں پر اس کا مبہم مغالطہ آمیز اور گمراہ کن ذکر کیا ہے۔ بابرنامہ کے صفحہ ۶۵۶ کے حواشی کے بیچ میں ہے کہ فیض آباد کے ڈی۔ جی نیول کا بیان ہے کہ ۱۵۲۸ء میں بابر اجودھیا آیا۔ ایک ہفتہ یہاں ٹھہرا۔ اس نے یہاں کے قدیم مندر کو (جو رام کی پیدائش کی جگہ تھی) منہدم کیا اور اس کی جگہ پر ایک مسجد بنوائی جو اب تک بابری مسجد کے نام سے بتائی جاتی ہے۔ اس پر دو کتبات ہیں، ایک باہر اور ایک منبر پر، دونوں فارسی میں ہیں اور دونوں میں ۹۳۵ھ درج ہے۔ یہ تاریخ عمارت کی تکمیل ہو سکتی ہے۔

مسز بیورج نے ڈی۔ جی نیول کا بیان تو نقل کر دیا ہے مگر ان کی تحقیق اور دانشوری کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ جاننے کی کوشش کرتیں کہ مسٹر نیول کو کس ماخذ کے ذریعہ سے یہ معلوم ہوا کہ بابر نے قدیم مندر کو توڑ کر اس کی جگہ پر مسجد بنوائی خصوصاً جب بابرنامہ میں اس کا کہیں ذکر نہیں۔ نیول کا بیان ہے کہ بابر نے ایک قدیم مندر کو منہدم کیا۔ ان کو اس کا نام تو معلوم نہ ہو سکا تھا، اور کیسے معلوم ہوتا جب وہ کسی حوالہ کے بغیر اپنی طرف سے لکھ رہے تھے۔ اس لیے بریکٹ میں اپنی طرف سے رام کی پیدائش کی جگہ لکھ دی، بریکٹ میں لکھنے کے معنی یہ ہیں کہ ان کو خود یقین نہ تھا کہ یہ رام کی پیدائش کی جگہ تھی، مگر اپنی سامراجی شرانگیزی میں یہ فتنہ برپا کرنے کی کوشش کی۔

مسز بیورج نے اپنے ضمیمہ ملا (یلو) میں بابری مسجد کے کتبات کو تو نقل کرتی ہیں مگر ان اشعار سے یہ ثابت نہیں کر سکیں کہ یہ مسجد رام جنم بھومی کو مسمار کر کے بنائی گئی تو اپنے حواشی کو ایک چور دروازہ بنا کر ان میں یہ لکھ گئیں۔

Presumably the order of the mosque was given during Babur's stay in Aud (Ajodhaya) in 934 A. H. at which time he would be impressed by the dignity and sanctity of the ancient Hindu sh. rine it (at least in part) displaced (') and like the obedient follower of Muhammad he was in intolerance of Faith would regard the substitution of a temple by mosque as dutiful and worthy. The mospue was founded in 935 A. H. but no mention of its completion is made in Baburnama. The Diary for 935 A. H has many minor lacunae, that of the year 934 A. H. has lost much matter breakig off when the account of Aud might be looked (P.LXXVI)

اس گنجلک اور پر پیچ عبارت میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ سب قیاسات پر مبنی ہیں، ان میں کوئی تحقیق نہیں، اسی لیے تحریر (قیاساً) (Presumably) کے لفظ سے شروع ہوتی ہے۔ جو تحقیق کا لفظ نہیں، بابر کا اجودھیا آنا یقینی نہیں اس لئے اودھ کے ساتھ بریکٹ میں اجودھیا لکھ دیا گیا ہے۔ اودھ اب بھی ایک خاص خطہ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، صرف اجودھیا کے لئے نہیں کیا جاتا پھر یہ بھی قیاساً لکھا گیا ہے کہ بابر یہاں کے ایک مندر یا کم از کم اس کے ایک حصہ کے رتبہ اور تقدس سے متاثر ہوگا پھر صریحاً متعصبانہ جھوٹ سے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کو منہدم کر دیا کرتے تھے، بابر آپؐ کا ایک فرماں بردار پیرو بن کر عدم رواداری ہو گیا۔ اس نے خیال کیا ہوگا کہ ایک مندر کی جگہ پر ایک مسجد بنا کر اپنے کو ایک فرض شناس اور لائق پیرو ثابت کرے گا۔ ان قیاس آرائیوں کے بعد مسز بیورج لکھتی ہیں کہ یہ مسجد ۹۳۵ھ میں مکمل ہوئی مگر بابرنامہ میں اس کی تکمیل کا ذکر نہیں۔ اس کے ذکر نہ ہونے کی تاویل اپنی قیاس آرائیوں سے اس طرح کی ہے کہ ڈائری میں ۹۳۵ھ کے بہت سے جزوی واقعات لکھنے سے رہ گئے ہیں ۹۳۴ھ کے تو بہت سے ایسے واقعات کھو گئے ہیں جن سے اودھ سے متعلق معلومات حاصل ہو سکتے تھے، ان قیاس آرائیوں کو صداقت تسلیم کرانے کی کوشش کو تحقیقی دانشوری نہیں کہی جا سکتی۔ مگر ایسے بیانات کا تدارک تجزیہ کرنے کی بھی ضرورت ہے۔

ایسا تجزیہ کرنے میں اڑیسہ کے موجودہ گورنر جناب بی، ان، پانڈے کی اس تقریر سے مدد لی جا سکتی ہے۔ جو انھوں نے راجیہ سبھا میں ۲۹ر جولائی ۱۹۷۷ء میں کی تھی۔ انھوں نے اس میں بتایا کہ ہندوستان میں انگریز مورخوں نے جو کتابیں لکھیں ان میں اس پر زیادہ زور دیا کہ ہندو مسلمان کس طرح ایک دوسرے کے خلاف تشدد آمیز رویہ اختیار کیے ہوئے تھے، وہ ایک دوسرے کے علاقے کو فتح کرتے اور لوٹ مار کے ذریعہ مذہبی تعصب دکھاتے، ان تاریخوں میں یہ بھی دکھایا گیا کہ مسلمان ہندوؤں کے کلچر اور روایات کو تہس نہس کرنے میں مشغول رہے ان کے مندروں اور محلوں کا انہدام کیا، ان کی مورتیاں توڑیں، اور ان کے سامنے یہ خونی شرط پیش کرتے رہے کہ اسلام قبول کرو ورنہ تلوار استعمال کی جائے گی۔

جناب بی، این پانڈے نے اپنی تقریر میں یہ بھی بتایا کہ برطانوی حکومت کے سرکاری دستاویزات سے یہ معلوم ہوا کہ لارڈ الگن کے زمانہ میں سکریٹری آف اسٹیٹ ووڈ نے اس کو ایک خط مورخہ ۳ر مارچ ۱۸۶۲ء میں لکھا کہ ہم لوگوں نے ہندوستان میں اب تک اپنا اقتدار اس طرح قائم کر رکھا ہے کہ ہم ہندو مسلمان کو ایک دوسرے کا مخالف بنا رہے ہیں اس کو جاری رکھنا چاہیے، جہاں تک ممکن ہو اس کی پوری کوشش کرتے رہنا چاہیے کہ یہاں کے لوگوں میں مشترکہ جذبہ پیدا نہ ہونے پائیں۔ ۹ر مئی ۱۸۶۲ء میں اسی ووڈ نے لارڈ الگن کو پھر لکھا کہ اس کو یقین جانیں کہ یہاں کے لوگوں کی ایک دوسرے کی دشمنی ہمارے لئے قابل اعتبار ہوگی۔ اگر پورا ہندوستان ہمارے خلاف متحد ہو جائے تو ہم وہاں کیسے باقی رہ سکتے ہیں؟

۲۹ر مارچ ۱۸۸۶ء میں ایک دوسرے سکریٹری آف اسٹیٹ جارج فرانسس ہملٹن نے لارڈ کرزن کو لکھا کہ ہم لوگ ہندوستان کے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیں، اس طرح کہ یہ دونوں اپنے خیالات میں مختلف ہوں اس لیے تعلیمی اداروں میں نصاب کی کتابیں ایسی پڑھائیں کہ یہاں کے مختلف فرقوں کے درمیان تفرقہ کی مضبوطی پیدا ہوتی رہے۔ ۱۴ر جنوری ۱۸۸۶ء میں اسی سکریٹری آف اسٹیٹ نے لارڈ ڈفرن کو لکھا کہ ہندوستان کے لوگوں میں مذہبی اختلافات پیدا کرنا ہمارے فائدہ کے لیے ہے، آپ نے ہندوستانی تعلیم اور اس کے نصاب کے بنانے کی جو تحقیقاتی کمیٹی بنائی ہے اس سے ہم اچھے نتائج کے متوقع ہیں۔

برطانوی حکومت کی سیاسی حکمت عملی کی روشنی میں، جی، ڈی نیول اور مسز اے ایس بیورج کی مذکورہ بالا تحریروں کا تجزیہ کرنا چاہیے، ان دونوں ہی پر کیا منحصر ہے ہندوستان کے آثار قدیمہ کے انگریز ماہرین پھر امپیریل اور ڈسٹرکٹ گزیٹیر کے مولفین کو جب اور جہاں موقع ملا انھوں نے واقعات کو توڑ مروڑ کر کے اور اپنی دانشورانہ قیاس آرائیوں اور دور از کار تاویلات سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں نے

ہندوؤں پر بڑے مظالم کیے، جن کو برابر خوفناک ذلتیں برداشت کرنی پڑیں، ان دونوں فرقوں میں کسی قسم کی مشترکہ قدریں نہیں رہیں۔

بابری مسجد کا تنازعہ بھی برطانوی حکومت کی سامراجیت کا شاخسانہ ہے مسز بیورج نے بظاہر بہت ہی دانشورانہ انداز میں یہ لکھا ہے کہ بابر نے ایک مندر کی جگہ ایک مسجد بنا کر اپنے رسولؐ کی اطاعت گذاری اور اپنی فرض شناسی کا ثبوت دیا۔ اگر اس کی یہی اطاعت گزاری اور فرض شناسی تھی تو اجودھیا کے سارے مندروں کو منہدم کرا سکتا تھا، اور پھر جب اس نے اپنی راجدھانی آگرہ میں قائم کی تو وہاں کے بھی کسی مندر کو باقی نہ رہنے دیتا۔ اس کے برخلاف مسز بیورج نے بابر کی جس تزک کا ترجمہ بابرنامہ کے نام سے کیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ جب وہ ہندوستان کے کسی اچھے مندر کو دیکھتا تو خوش ہو کر اس کی تعریف کرتا۔ مثلاً جب وہ گوالیار کے قلعہ میں پہونچا تو وہاں کے عالی شان بت خانہ کا ذکر اس طرح کرتا ہے کہ یہاں کے تالاب کے مغرب میں ایک عالی شان بت خانہ ہے، سلطان شمس الدین التمش نے اس بت خانہ کے پہلو میں ایک مسجد بنائی ہے۔ یہ بت خانہ اتنا بلند ہے، کہ بلندی میں اس سے اونچی کوئی عمارت نہیں ہے۔ دھول پور کے پہاڑ پر سے گوالیار کا قلعہ اور بت خانہ خوب نظر آتا ہے، کہتے ہیں کہ اس بت خانہ کا سارا پتھر وہاں کے تالاب کو کھود کر حاصل کیا ہے (ص۔ ۶۱۰)

اگر بابر کے لیے مندروں کو مسمار کرنا مذہبی فریضہ تھا، تو گوالیار کے اس عالی شان بت خانہ کی تعریف کرنے کے بجائے اس کو منہدم کر دیتا، اس نے گوالیار کی بعض ننگی مورتیوں کا بھی ذکر کیا ہے لیکن ان کو بھی مسمار کرنا پسند نہیں کیا۔ (ص۔ ۶۱۱، ۶۱۲) گوالیار کے بت خانے کے پہلو میں سلطان شمس الدین التمش کی بنائی ہوئی ایک مسجد سے یہ ظاہر ہے کہ التمش نے بھی اس بت خانہ کو منہدم کرنا پسند نہیں کیا۔ اسی طرح بابر کے ایک امیر نے اجودھیا میں کسی مندر ہی کے پاس ایک مسجد بنا دی تو اس میں کون سی بات تعجب انگیز ہو سکتی ہے۔ اگر اس کے جائے وقوع کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ اس کے آس پاس مسلمان آباد ہو چکے تھے، کیونکہ اسی سے متصل حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے مشہور خلیفہ حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی کا آبائی مکان تھا۔ جس سے ظاہر ہے کہ یہ مسلمانوں کا محلہ بن چکا تھا۔ اگر یہاں ایک مسجد مسلمانوں کے لیے بنا دی گئی تو کون سے جرم کا ارتکاب ہوا؟

بابر ایک بیرونی فاتح ضرور تھا۔ مگر اس کے کارناموں کا مطالعہ جس حیثیت سے بھی کیا جائے گا یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس کی شخصیت بہت ہی دل آویز اور دلکش تھی۔ خود مسز بیورج نے ولیم ارسکن کا ایک لمبا اقتباس دے کر اس بات کی تائید کی ہے کہ ایشیا کا کوئی فرماں روا اس کا مدمقابل نہیں ہو سکتا ہے (بابرنامہ صفحہ ۱۷) پھر اس پر رام جنم بھومی کے انہدام کا من گھڑت الزام رکھ کر اس کو عدم رواداری یعنی ظالم اور مذہبی جنون قرار دینا کہاں تک صحیح ہے، ہندو مورخین بھی بابر کی شخصیت کی دل آویزی سے متاثر ہیں۔ مغلوں کے آخری دور کے مورخ سبحان رائے نے اپنی خلاصۃ التواریخ میں اس کے بارہ میں لکھا ہے کہ:۔

درداد وعدل مبالغہ فرمودی

موجودہ دور کے مورخوں میں جناب رام پرشاد کھوسلا جب پٹنہ یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر تھے تو انھوں نے ۱۹۳۲ء میں مغل کنگ شپ اینڈ نوبلیٹی لکھی، اس میں بابر کے اوصاف کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بابر کی تزک میں ہندوؤں کے کسی مندر کے انہدام کا ذکر نہیں اور نہ اس کا ثبوت ہے کہ اس نے کفار کا قتل عام ان کے مذہب کی وجہ سے کیا وہ نمایاں طور پر مذہبی تعصب اور تنگ نظری سے بری تھا (ص۔ ۷، ۸) ڈاکٹر راجندر پرشاد نے بابر کی مذہبی رواداری کا ذکر جس طرح کیا اس کا حوالہ ہم فروری کے معارف میں شذرات میں دے چکے ہیں۔

پنڈت جواہر لال نہرو بھی بابر کی دلکش شخصیت سے متاثر تھے وہ اپنی کتاب ڈسکوری آف انڈیا میں لکھتے ہیں کہ وہ نشاۃ الثانیہ کے دور میں نمونہ کا تھا، بہادر تھا، مہم جو تھا، آرٹ لٹریچر اور اچھی زندگی کا شائق تھا، الہ آباد یونیورسٹی کے ڈاکٹر رام پرشاد ترپاٹھی اپنے زمانے کے مشہور مورخ گزرے ہیں، انھوں نے اہم تصنیف رائز اینڈ فال آف دی مغل امپائر میں لکھا ہے کہ بابر میں مذہبی جنون نہ تھا، اس کا رویہ ہندو افغانی امراء اور رعایا کے ساتھ ہمدردانہ شریفانہ اور دوستانہ رہا۔

پھر وہ ایک لمبے تبصرہ میں رقمطراز ہیں کہ مغل سلطنت کی شان و شوکت صرف اس کی فوجی قوت میں نہ تھی بلکہ اس کی شان غیر مسلم رعایا اور خصوصاً راجپوتوں کے ساتھ اس کی مذہبی رواداری میں تھی، پھر اس زمانہ میں کلچر کو جو فروغ ہوا وہ بھی ایک شاندار کارنامہ ہے، اکبر کو اس کے مرتبہ سے محروم نہیں کیا جا سکتا، لیکن اس پالیسی کا بیج اس کے ممتاز دادا بابر ہی کی حکومت کے زمانہ میں ڈال دیا گیا تھا، ایک ایسی سلطنت قائم ہوئی جس کی سیاست میں مذہبی اور طبقاتی اختلاف کا کوئی ذکر نہیں رہا تخت و تاج کی حیثیت ریاست میں خاطر خواہ طریقہ پر رکھی گئی، راجپوتوں کے مسائل دوستی اور شادی بیاہ کے رشتے سے حل کیے گئے۔ دربار کے تہذیبی پہلوؤں کو زیادہ اہم قرار دیا گیا، لیکن ان تمام باتوں کی ابتداء بابر ہی کے زمانے میں ہو گئی تھی، جس نے ایک نئی سلطنت قائم کرنے کا راستہ ہی ہموار نہیں کیا، بلکہ کس طرح اس پر حکومت کی جانی چاہیئے، اس کی پالیسی بنانے کا اشارہ بھی کر دیا، اس نے ہندوستان میں ایک ایسا خاندان اور ایک ایسی روایت قائم کی جس کی مثال دوسرے ملکوں میں نہیں ملتی۔

ہندوستان کے ایسے بڑے محسن اور ایسی دلکش شخصیت کو بابری مسجد کے جھگڑے میں الجھا کر ملک کی شاندار روایت مجروح کرنا ہے اور اس کی ذات سے من گھڑت واقعات منسوب کر کے نہ صرف ہندوستان کے علم اور دانشوری کو بدنام کرنا ہے بلکہ ملک کے سیکولرزم، قومی یک جہتی اور وطن دوستی کے ساتھ دشمنی کا ثبوت دینا ہے۔

بقیہ صفحہ ۱۲ کا

دینی مدارس میں زیر تعلیم طلبہ کی تربیت اس ڈھنگ سے کرنی ہوگی کہ جو عملی میدان میں قدم رکھنے کے بعد قوم وملت کے لئے فعال ثابت ہوں جن کے دلوں میں ملت کا غم ہو اور اس کے دکھ درد کا احساس ہو، جو اپنی تحریر و تقریر کو صالح مقاصد کے لئے استعمال کر کے پوری قوم کی رگوں میں جوش ایمانی دوڑا دیں، جو ہر قومی فلاحی تحریک میں اپنے آپ کو پیش پیش رکھیں اور اپنی اہلیت وصلاحیت کا لوہا منوا لیں۔

آج بھی اس مرد مجاہد کی آواز کے لئے کان ترس رہے ہیں جو اندھیاری میں بھٹکتی ہوئی قوم میں "ھلموا الی عباد اللّٰہ" کی آواز بلند کر کے ان کے ہاتھ تھام لے، آج بھی امت اسی زمرہ میں سے کسی سید اسماعیل شہیدؒ، حسین احمد مدنیؒ، محمد علی جوہرؒ اور ابو الکلام آزادؒ کے ظہور کی منتظر ہے، یہ جوہر آج بھی باقی ہے یا نہیں یہ حقیقت امت کے سامنے اجاگر کرنے کی ضرورت ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ اس حقیقت بھری داستان کو بھی کرامت کی طرف سے ہم آنکھیں موند لیں اور امت حسرت بھری نگاہوں سے ہمیں تکتی رہ جائے۔ ع

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا
ہمی سو گئے داستاں کہتے کہتے

یاد رکھئے! اگر ایسا ہوا تو ہم نہ صرف عنداللہ ماخوذ ہیں بلکہ امت کی تباہی کے جرم میں آنے والا وقت اور تاریخ ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔

کلید آیات

۱۰/- روپے

کسی بھی آیت قرآنی کے حوالہ کے لئے

★ ۷۰۰۰ سے زائد منتخب الفاظ ★ اردو لغات کی مانند ترتیب
★ آفسیٹ کی دیدہ زیب طباعت ★ ۱۷۶ صفحات

سادہ ڈاک سے ۱۱/- روپے
رجسٹری سے ۱۲/- ”

محمد خالد محمد یوسف پٹیل ۳۵ پٹیل محلہ نظام پورہ
پوسٹ بھیونڈی ۴۲۱۳۰۲ ضلع تھانہ

دیورس جی پہلے اتہاس (تاریخ) پڑھیے

ایک حقیقت پسند ہندو بھائی کے قلم سے

گزشتہ چند مہینوں میں آر ایس کے سرسنگھ چالک شری بالا صاحب دیورس نے دہلی، بنگلور اور بمبئی میں جو تقریریں کی ہیں انھیں یکجا کر کے مشہور صحافی اور کلکتہ سے شائع ہونے والے ہندی ہفت روزہ۔ "رویوارہ" کے ایڈیٹر جناب اودین شرما نے ہفت روزہ کی ایک حالیہ اشاعت میں شائع کیا ہے اور اس کے بعد اگلے ہی صفحہ پر اپنا ایک مضمون "دیورس جی، پہلے اتہاس پڑھئے" کے عنوان سے شائع کیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ بالا صاحب کو ایسا جواب شاید ہی آج تک کسی نے دیا ہو یا کوئی دے سکے۔ فرقہ پرستی کے متعلق شرما صاحب نے لکھا ہے "لیکن اکثریت کی فرقہ پرستی ہمیشہ زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ اور ملک کے لیے زیادہ تباہ کن ہوتی ہے۔ اکثریت کی فرقہ پرستی، تاناشاہوں ہتھیاروں اور ہٹلروں کو جنم دیتی ہے۔ جس کے نتیجہ میں ملک ٹوٹتا ہے... پچھلے کچھ مہینوں سے دیورس جی جس زہریلی زبان کا استعمال کر رہے ہیں اسے سنجیدگی سے لینا ہوگا..... وہ ہندوؤں کے لئے آج کل کافی فکر مند ہیں جیسے پانچویں دہائی میں ان کے گرو گاندھی جی کی حرکات و سکنات سے فکر مند تھے"

بھارت کے اس ماضی کے متعلق جس کی تعریفوں کے پل بالا صاحب باندھتے رہتے ہیں جناب اودین شرما نے لکھا ہے "دیورس جی ماضی کی جھوٹی شان کے سہارے ہندو سماج کو ورغلانا چاہتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ وہ دوسروں سے افضل ہیں اور ان کی فراخدلی کی وجہ سے ہی باقی مذاہب اور فرقے اس ملک میں بچے ہیں جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ جب جب ہندو سماج میں دیورس جی جیسے لوگ معروفِ عمل ہوئے ہیں، سماج کا کوئی نہ کوئی حصہ اس سے جا چھٹکا ہے۔ آج سکھ ہم سے الگ ہیں تو اس کے لیے سکھ فرقے سے زیادہ ہندو فرقہ پرستی ذمہ دار ہے"

ہندو سماج کے تاریخی منظر کا باریکی سے جائزہ لیتے ہوئے شرما صاحب نے کہا ہے "دیورس جی اپنی تقریروں میں یہ کہنا بھول جاتے ہیں کہ بھارت پر مسلمانوں کے حملوں سے پہلے ہی ہندو سماج اپنی جھوٹی شان، کٹرتا اور الحاد کے سبب منتشر ہو چکا تھا۔ حملہ آوروں نے آکر انھیں آرام سے ٹھونک لیا۔ اس کے بعد بھی اس سماج نے خود کو وقت کے مطابق نہیں ڈھالا جس کی وجہ سے غریب اور استحصال زدہ طبقہ پہلے مسلمان اور پھر عیسائی بن گیا۔ دیورس جی کو تبدیلی مذہب پر کافی تکلیف ہے لیکن وہ یہ نہیں بتاتے کہ آخر آدی باسی غریب عیسائی مذہب کیوں اختیار کرتا ہے۔ یا ہریجن جھونپڑے میں رہ کر بھی مسلمان کیوں بنتا ہے؟ آپ انھیں برابری کا درجہ دے نہیں سکتے، ریزرویشن مخالفت آندولن میں آپ شرکت کریں گے اور جب ردِّ عمل میں ہریجن دوسرے مذہب کی طرف مخاطب ہوتے ہیں تو قومی یک جہتی پر آنچ آنے لگتی ہے"

بالا صاحب کا یہ کہنا ہے کہ ہندوستان میں مسلمان اور عیسائی آئے تو ہندوؤں نے انھیں ہر طرح کی سہولیات مہیا کر دیں اس بات کی سختی سے تردید کرتے ہوئے شرما صاحب نے لکھا ہے "یہ دعویٰ ایکدم مضحکہ خیز ہے۔ محمود غزنوی، محمد غوری، یا علاء الدین خلجی کو کس نے اجازت دی تھی کہ ہندوستان پر حملہ کرو؟ طاقتور کو کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں پڑتی۔ انگریزوں نے بھارت پر حکومت کرنے کے لئے کس کی اجازت لی تھی؟ شاید ہم لوگوں نے ہی ہونوں، شکوں اور نادر شاہ کو اجازت دی تھی کہ آپ لڑیں۔ جس دھرم کے ٹھیکیداروں نے مزدور طبقے کو شودر بنا دیا ان سے کسی بھی مذہب تک کی حفاظت کی توقع کرنا حماقت ہے۔ بالا صاحب اور ان کا گروہ انھیں ٹھیکیداروں کی نمائندگی کرتا ہے"

ہندوستان کی تاریخ کی یاد دلاتے ہوئے اور حوالے پیش کرتے ہوئے جناب اودین شرما نے لکھا ہے "دراصل بالا صاحب جیسے مفکر تاریخ کا مطالعہ اپنے نظریے سے کرتے ہیں۔ وہ اس تاریخ کی دہائی دیتے ہیں جو تاریخ انگریزوں نے ہمیں جان بوجھ کر پڑھائی ہے۔ مسلم تاریخ ہندو تاریخ لیکن ہندوستان کی تاریخ غائب ہے۔ دیورس جی کو بھی یہی تاریخ بھاتی ہے کہ ہندوستان کا نقشہ چھوٹا ہو گیا لیکن کس کی غلطی سے؟ محمد بن قاسم کو سبھی پہلا حملہ آور مانتے ہیں۔ لیکن یہ نہیں بتاتے کہ اسے سندھ کے راجہ سے ناراض ہندوؤں نے ہی بلایا تھا..... شروع میں رانا سانگا نے بابر کے پاس خبر کہلوائی تھی کہ آ ہی گئے ہیں تو ابراہیم لودی سے لڑیں.... پرتھوی راج چوہان نے کس طرح نام نہاد پچھڑی جات کے سورماؤں کو مروایا اس کا ذکر دیورس جی کے بھاشنوں میں نہیں ہوتا، سومناتھ کی لوٹ کے وقت اکیلا محمود غزنوی نہیں تھا۔ ان کے ساتھ سینکڑوں غیر مسلم ہندوستانی بھی تھے.... کیا محمد غوری ہماری اجازت سے ہی ہندوستان کا مالک بنا تھا؟ پھر جن ہندو راجاؤں نے ہندو مندر توڑے انھوں نے کس سے اجازت لی تھی؟ گیارہویں صدی میں کشمیر کے راجہ ہرش نے مندروں کو توڑا۔ آسام میں ویشنوؤں نے کرشن کے سبھی مندر توڑے تھے، دیورس جی اس کا ذکر نہیں کرتے۔ اورنگ زیب نے اگر ہندوؤں پر جزیہ لگایا تھا تو مسلمانوں پر زکوٰۃ۔ دونوں ٹیکس فوج کھڑی کرنے کے لئے تھے۔ رانا پرتاپ آج آر ایس ایس کے لئے ہندو شاسن کی اکھنڈتا کے مظہر ہیں جبکہ وہ مغلوں سے اپنے راجیہ (میواڑ) کے لئے لڑے تھے"

ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ اگر ہم تعصب اور جانبداری کی عینک اتار کر کریں تو ہم دیکھیں گے کہ ایک بادشاہ اور ایک راجہ کے مابین جو جنگیں ہوئی ہیں یا جو کشیدگی رہی ہے وہ جنگیں یا کشیدگی ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین نہیں تھی۔ مگر انگریزوں نے جو تاریخ لکھی اور ہمیں پڑھائی اس میں یہی تاثر پیش کیا گیا۔ کیوں کہ انگریزوں کی پالیسی ہی، لڑاؤ اور حکومت کرو، کی رہی ہے۔ ہندو مسلم یک جہتی ہندوستان میں انگریزوں کے وجود کے لئے خطرہ تھی۔ اس لئے انگریزوں نے ہماری ہی تاریخ ہمارے سامنے اس طرح پیش کی کہ ان دو فرقوں کے درمیان نفرت کی دیوار کھڑی ہو گئی۔ بالا صاحب جیسے لوگ آج بھی اس گمراہ کن تاریخ کو اپنی بائبل مانتے ہیں، اس ضمن میں جناب اودین شرما نے لکھا ہے "ہلدی گھاٹی میں رانا پرتاپ کی فوج کا سپہ سالار ایک مسلمان تھا اور اکبر کی فوج کا سپہ سالار ایک راجپوت تھا۔ رانا پرتاپ کی فوج میں پٹھان بہت بڑی تعداد میں تھے، اور اکبر کی فوج میں ہندو بڑی تعداد میں تھے۔ اورنگ زیب کو ہم نے مغل راجیہ کے سب سے بڑے مذہبی جنونی کے روپ میں پیش کیا ہے مگر اُجین کے مہاکالیشور مندر کے رکھ رکھاؤ کا خرچ بھی وہی دیتا تھا۔ دیورس جی کو شاید پتہ نہیں کہ غزنی کے جو سکے ملے ہیں ان پر سنسکرت میں کلمہ لکھا ہے۔ چتوڑ کی کیرتی مینار پر "اللہ" کھدا ہوا ہے۔ اکبر نے جو سکے چلائے تھے ان پر رام سیا لکھا ہوا ہے۔ شیواجی کو آج پورے دیش میں دھرم کا عظیم محافظ بتایا جا رہا ہے لیکن انھوں نے کہیں بھی یہ نہیں کہا کہ اورنگ زیب بادشاہ نہیں ہے۔ وہ دہلی کے تخت سے بٹے وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ مراٹھا راجیہ پر ان کا اقتدار رہے تو وہ اورنگ زیب کو بادشاہ ماننے کو تیار ہیں۔ شیواجی کی فوج میں ہزاروں مسلمان تھے، خود اورنگ زیب کی فوج میں بڑے بڑے عہدوں پر بہت سے راجپوت تھے"

ہندوستان کس کا ہے اور اس کی سالمیت کس طرح برقرار رہ سکتی ہے اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے فاضل مصنف نے لکھا ہے "دراصل ہندو دھرم کے ٹھیکیداروں کا مذہب اور فلسفہ کا علم صفر رہا ہے۔ آج جو ہندوستان ہے وہ نہ سکھ کا ہے، نہ عیسائی کا، نہ ہندو کا نہ مسلمان کا۔ اس پر جتنا حق ہندو کا ہے، اتنا ہی مسلمان کا۔ فرقہ پرستی اس ملک کو توڑتی رہی ہے اور فراخدلی اس ملک کو بچاتی رہی ہے۔ ملک کو مہاتما گاندھی بچاتے ہیں، آر ایس ایس توڑتا ہے۔ فرقہ پرستی سے فرقہ پرستی نہیں لڑ سکتی ہے۔ ایسے حالات پیدا ہونے پر ملک ٹوٹتے ہیں ہندوستان کو اس خطرے سے بچانا ہوگا فرقہ پرستی سے سیکولر طاقتیں ہی لڑ سکتی ہیں ملک اس دن ختم ہو جائے گا، ٹوٹ جائے گا جس دن ہم بند دماغ سے سوچنے لگیں گے اور ذہنیت پر انحصار کر لیں گے"

(بشکریہ دارالسلطنت دہلی)

ایک مبارک سفر کی کچھ خوشگوار یادیں

محمد برہان الدین سنبھلی
(استاد تفسیر دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

ایک خنک شام کو "عمرہ مبارک ہو" کی دلنواز صدا اچانک کانوں میں رس گھولتی، دل کی گہرائی میں اترتی اور رُواں رُواں کھلاتی چلی گئی۔

ہُوا یہ کہ۔ غالباً نومبر ۱۹۸۵ء کا مہینہ تھا حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے ساتھ راقم سطور مسلم پرسنل لا کی ورکنگ کمیٹی کی دہلی میٹنگ میں شرکت کی غرض سے۔ حافظ کرامت اللہ صاحب کی کوٹھی۔ نظام الدین میں مقیم اور نماز عصر کی تیاری میں مشغول تھا حضرت مولانا مدظلہ، نماز گاہ، ہم لوگوں سے پہلے پہنچ گئے تھے، راقم تھوڑی دیر بعد وہاں پہنچا تو داخل ہوتے ہی..... یہ جانفزا اور روح پرور کلمات۔ مولانا مدظلہ نے۔ راقم کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمائے، اور استعجاب رفع کرتے ہوئے۔ یا اس اجمال کی تفصیل بتاتے ہوئے۔ فرمایا کہ ابھی ابھی جدہ سے "البنک الاسلامی" کے اہم کارکن کا فون آیا تھا، جس پر انھوں نے بتایا کہ ایک اہم مسئلہ (جس کی تعیین بھی کی، تفصیل آگے آ رہی ہے) پر غور و فکر کرنے کے لئے عنقریب "البنک الاسلامی" جدہ میں علمائے اسلام کا اجتماع کرنے والا ہے، آپ (مولانا مدظلہ) اس میں شرکت کے لئے نام دیجئے"۔ جواباً مولانا موصوف نے۔ از راہ حسن و ذرہ نوازی۔ راقم کا نام بتا دیا،

بس اس دن سے برابر انتظار رہنے لگا کہ دیکھئے وہ ساعت سعید کب آتی ہے جس میں حرمین شریفین کی زیارت سے یہ گناہ گار، اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرے اور گناہوں کے داغ و دھبے دھو کر آنکھوں کی راہ سے میل کچیل نکالے!!۔ بتانے کی ضرورت نہیں کہ انتظار کی گھڑیاں کتنی تلخ اور دراز ہو جاتی ہیں، اور پھر جب ان کا طول اندازے کے زمانی پیمانے سے بڑھ جائے تو کرب و اضطراب کا صحیح تصور وہی کر سکتا ہے جسے کبھی اس طرح کی صورتحال سے دو چار ہونا پڑا ہو!۔

یہ مژدۂ جانفزا۔ یا شیریں خواب!۔ تعبیر ظاہر ہونے میں۔ دیر لگنے کی وجہ سے جاں گسل حسرت میں تبدیل ہوتا نظر آنے لگا تھا کہ اچانک ایک تپتی دوپہر۔ مارچ کے نصف آخر۔ میں قاصد (پوسٹ مین) نوید مسرت (دعوت نامہ) لے کر پہنچ ہی گیا، جس کی ٹھنڈک سے دوپہر کی گرم ہوا نسیم صبح کی سی خوشگوار فضا میں بدلی محسوس ہونے لگی، کہ اسی وقت بستر استراحت چھوڑا، سفر کی تیاری کے لئے مستعد و مشغول بنا دیا۔ سب سے پہلا کام دعوت کی منظوری جلد از جلد بھیجنا تھا، اجتماع کی تاریخ اور دعوت نامہ کے پہنچنے کے درمیان وقفہ بہت کم رہ جانے کے سبب ٹیلی گرام ہی کے ذریعہ مطلع کیا جا سکتا تھا اسی کی ہدایت بھی دعوت نامہ میں کی گئی تھی، تاکہ اس کے بعد وہاں سے سفر کی قانونی کارروائیاں شروع کی جائیں۔ باہر کے سفر کا جنھیں کبھی تجربہ ہوا ہے وہ جانتے ہیں کہ ان..... میں کتنا وقت لگتا اور کس قدر صبر آزما مراحل سے گزرنا پڑتا ہے،

دعوت نامہ کا جواب۔ مذکورہ بالا وجوہ سے۔ اسی وقت ہی دیا جانا مناسب معلوم ہوا، مگر ایسے وقت جبکہ یہاں عام طور پر لوگ محو استراحت اور قیلولہ کی سنت کا لطف اٹھانے میں مشغول ہوتے ہیں، کسی کو تار کا مناسب مضمون تیار کرنے کی تکلیف دینا ایک مسئلہ، سے کم نہ تھا کیوں کہ وہ سرور و نشاط جس نے راقم کے لئے آفتاب کی تمازت کو گویا چاندنی جیسا خنک بنا دیا تھا کسی اور میں ہونا مستبعد ہی تھا۔ ایسے وقت بس ان مخلص اہل تعلق کی ہی طرف ذہن منتقل ہونا یا ہو سکتا ہے جن کے آئینۂ اخلاص میں تعلق کی بنا پر خوشی کا عکس و اثر منتقل ہو جانے کی امید ہو۔

چنانچہ اسی خیال میں گم ہو کر مخلص و کرم فرما محترم مولانا واضح حسنی ندوی صاحب کے پاس پہنچا، وہ اندازہ کے مطابق محو خواب تھے مگر شوق میں بڑے قدموں کی چاپ اور دل سے نکلے سلام کی آواز نے انھیں نہ صرف میٹھی نیند سے چھڑا دیا بلکہ حسب توقع۔ شاید اسی خوشی میں شریک بنا کر، تار کا مضمون تیار کرنے بٹھا دیا، اور پھر اسی وقت ایک سعید طالب علم کے ذریعہ تار گھر بھجوا کر منزل مقصود کی طرف روانہ کر دیا۔ اس کے بعد گویا "السعی منی والاتمام من اللہ" کا وظیفہ زبانِ حال سے پڑھنے میں وقت گزرنے لگا۔

اس مرتبہ انتظار کی تلخی پہلے سے کہیں بڑھی ہوئی تھی، وہ آتش شوق کی تیزی بھی فزوں سے فزوں تر ہو رہی تھی، اور جوں جوں اجتماع کی تاریخ قریب آ رہی تھی امید و بیم کی کشمکش شدید سے شدید تر ہوتی جا رہی تھی یہاں تک کہ ہر لمحہ گوش بر آواز رہنے اور ہر آنے والے کو نامہ بر یا نوید آور، گمان کرنے کی سی کیفیت رہنے لگی، پھر تو وہ حالت ہو گئی جسے بیان کرنے کے لئے قرآن مجید کے معجزانہ اسلوب "حتیٰ اذا استیأس الرسل وظنوا انہم قد کذبوا" سے بہتر انداز انہیں مل سکتا، اس کے بعد بڑھتے بڑھتے "وبلغت القلوب الحناجر وتظنون باللہ الظنونا" میں پیش کیے گئے نقشہ کے مشابہ صورت ہو گئی یہاں تک کہ وہ دن بھی گذر گیا جس کے بعد وسائل سفر مہیا ہو جانے کی صورت میں بھی سفر مشکل بلکہ عملاً ناممکن نظر آ رہا تھا، اور اس کی رات بھی تقریباً نصف بیت چکی تھی، اب آس مکمل یاس میں تبدیل ہوتی اور یکسوئی سی ہو چلی تھی کہ اچانک کسی نے دروازہ پر زور سے دستک دی، اور "کون" کے جواب میں کہا چوکیدار، "لیجئے تار آیا ہے" بس اسی جملے سے ہی آس کی سوکھی ٹہنی۔ ایسا لگا کہ۔ ترو تازہ ہونے لگی۔ تار کے مضمون سے اندازہ کا صحیح ہونا معلوم ہوا کیوں کہ اس میں ٹکٹ بھیجے جانے اور فلاں..... پرواز سے سفر کرنے کی اطلاع دی گئی تھی۔ مگر اب یہ فکر سوار ہوئی کہ اتنے سارے کام اتنی تھوڑی مدت (صرف دو دن) میں کس طرح انجام پا سکیں گے، لیکن جس ذات عالی۔ قادر مطلق۔ نے یاس کو آس میں بدلا تھا اسی کی مدد اور فضل و کرم کی امید تھی..... کسی طرح یہ رات کاٹی اور صبح ہوتے ہی کاموں کے انجام دینے کی فکر شروع کی ایک اہم کام (امیگریشن) محترم مقبول احمد صاحب کی خصوصی عنایت و توجہ سے لکھنؤ ہی میں دن کے دن انجام پا گیا، بقیہ کے لئے تجربہ کار مخلصین کا مشورہ ہوا کہ آج ہی رات دہلی روانہ ہو جانا ضروری ہے تاکہ کل علی الصباح دہلی پہونچ کر بقیہ کاموں کی انجام دہی ہو سکے لیکن اتنی کم مدت میں دہلی کا بھی سفر۔ یعنی رزرویشن ملنا۔ آسان نہیں ہوتا مگر یہ مشکل بھی بفضل خدا کسی نہ کسی طرح۔ جعفری صاحب اور قاری محمد موسیٰ افریقی کے ذریعہ۔ حل ہو گئی، اور صبح ہی صبح دہلی میں مخدومی و محترمی مولانا ابوبکر حسنی مدظلہ کے دولت کدہ پر۔ جو تقریباً ربع صدی سے راقم کے لئے دہلی میں سب سے زیادہ مانوس بلکہ محبوب مسکن ہے۔ فروکش ہو گئے، بھاگ دوڑ کے کاموں میں مجھ جیسے ناواقف کو کسی واقف مخلص کی رفاقت کی بھی ضرورت تھی، وہ محترم مولوی قمر علی صاحب ندوی۔ جن میں اللہ نے خدمت خلق کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ کے ایثار سے پوری ہو گئی ویسے دہلی پہونچنے کے بعد عزیز گرامی قدر میاں مولوی خالد حسنی ندوی (نواسۂ مکرم) نے تمام ضروری کاموں کی تکمیل کی مشکل ذمہ داری کو خود سنبھال لیا اور ان کی وجہ سے بسہولت ویزا وغیرہ حاصل ہو گیا (اللہ تعالیٰ ان سب لوگوں کو اپنے شان عالی کے مطابق اجر و صلہ مرحمت فرمائے) آخری مرحلہ ٹکٹ کے حصول کا رہ گیا تھا، ویزا لے کر جب "ایر انڈیا" کے نئی دہلی آفس پہنچے تو دفتر بند ہونے میں بس کوئی آدھ گھنٹہ رہ گیا تھا، اتنے مختصر وقت میں کام کر دینے کا ہمارے ملک میں دفتری عملہ یوں بھی عادی نہیں ہے پھر میرے ٹکٹ کے بارے میں تعویق کا تو ایک قانونی بہانہ بھی انھیں مل گیا تھا، وہ یہ کہ ٹکٹ لکھنؤ سے سفر کے لئے ہے اور وہیں بھیج دیا گیا ہے۔ لہٰذا یہاں (دہلی) سے اس وقت تک نہیں دیا جا سکتا جب تک لکھنؤ کا دفتر یہ تصدیق نہ کر دے کہ وہاں سے ٹکٹ جاری نہیں کیا گیا ہے، ظاہر ہے کہ اتنے مختصر وقت میں لکھنؤ سے رابطہ قائم کرنا محال تھا، یہاں پھر اللہ تعالیٰ کا فضل خاص اس طرح ظاہر ہوا کہ ایر انڈیا کے دفتر کا سب سے بڑا ذمہ دار افسر۔ جو پہلے اسی دلیل کی بنا پر ٹکٹ نہ دینے میں اپنے ماتحت متعلق افسر کا ہمنوا تھا۔ تھوڑی سی گفتگو کے بعد اتنا متاثر ہو گیا کہ نہ صرف ٹکٹ دینے پر راضی ہو گیا بلکہ اسے اپنا مسئلہ بنا لیا، چنانچہ وہ خود اٹھ کر اپنے ماتحت متعلقہ افسر کے پاس گیا اور با اصرار ٹکٹ بنوایا۔ یہاں اللہ تعالیٰ کی مدد پھر ایک اور شکل میں ظاہر ہوئی کہ جب اسی افسر نے کمپیوٹر سے دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ میرے لئے لکھنؤ سے جدہ تک تمام متعلق جہازوں میں سیٹ کا رزرویشن اور کنفرمیشن جدہ ہی سے کرا دیا گیا ہے، اس طرح وہاں سے ٹکٹ اور اطمینان کی

دولت لے کر مستقر واپس ہوئے، اب حرف دیارِ حبیب کا۔ پر شوق سفر ہی باقی رہ گیا تھا، سو وہ وقت بھی جلد ہی آگیا کہ ۱۵ اپریل ۱۹۸۶ء کو علی الصباح قیام گاہ سے۔ مخدومی مولانا ابو بکر صاحب مدظلہ وغیرہ کی دعائیں لے کر ایرپورٹ کی طرف، برادر عزیز سلطان الدین قمر سنبھلی سلمہٗ اور مکرمی ماسٹر محمد نفیس صاحب دہلوی کی معیت میں روانگی ہوئی، پھر وہ ساعت سعید بھی آگئی کہ۔ جس منزل کی طرف سر کے بل جانا بھی کمالِ سعادت ہے۔ اُدھر، شوق کے ہی نہیں، فولاد کے پروں سے پرواز شروع ہوئی اور چشم زدن میں ایسا محسوس ہوا کہ ہم سب مسافر فضائے بسیط میں معلق ہیں اور قرآن مجید کی آیت (الم یروا الی الطیر مسخرات فی جو السماء ما یمسکھن الا اللہ) کی عملی تفسیر بلکہ تصویر بنے ہوئے۔

روانگی:۔ جہاز کی پرواز جیسے ہی شروع ہوئی اُن دعاؤں و آیتوں کی تلاوت کی پرکیف و اثر انگیز آواز گونجنے لگی جن کا سفر کے وقت پڑھنا مسنون ہے، اس منظر سے روح کو ایسی شادمانی حاصل ہوئی کہ رقص کرنے کا جی چاہا، اِدھر کچھ مدت سے سعودی ایرلائنس کی ہر پرواز کے وقت یہ معمول لازم کر دیا گیا ہے۔ (فالحمد للہ علی ذالک) کیوں کہ جہاں عام طور پر جام و سبو کے دور چلتے اور نغمہ و سرود کے زمزمے گونجتے ہوں وہاں احادیث و آیاتِ دعا کی تلاوت نیز مدینہ طیبہ کی کھجور اور عربی قہوہ سے تواضع! ایک مسلمان کے لئے جس درجہ مسرت بخش بلکہ وجد انگیز بات ہے اس کا اندازہ کسی صاحب ایمان کے لئے مشکل نہیں۔ جہاز چند گھنٹوں کی پرواز کے بعد پہلے 'ریاض' پھر جدہ ہوائی اڈہ پر اترا جو اس کی آخری منزل تھی، ایرپورٹ کی عمارت کے اندر داخل ہوتے ہی۔ لاؤڈ اسپیکر سے گونجنے والی عصر کی اذان کی روح پرور آواز کان میں پڑی (جو ہمارے جیسے ملک کے باشندوں کے لئے ایک تعجب خیز بات ہی کہی جاسکتی ہے۔ لیکن وہاں کا یہ معمول ہے) پھر وہیں ایک جگہ جماعت ہوتی نظر آئی، بحمد اللہ اس میں شرکت کی سعادت میسر ہوئی۔ نماز سے فارغ ہوتے ہی داعی (بنک) کے نمائندہ نے جو۔ میری تلاش میں تھے اور استقبال کے لئے آئے تھے۔ گرمجوشی سے مصافحہ کیا، ان کی وجہ سے کسٹم کی دشوار گذار گھاٹی باآسانی طے ہو گئی۔ پھر ایک موٹر میں بٹھاتے ہوئے کہا کہ یہ موٹر آپ کی تحویل میں رہے گی اس سے مکہ مکرمہ بھی جا سکتے ہیں، پہلے ہوٹل جانا ہے، جہاں قیام رہے گا' چنانچہ وہ موٹر فراٹے بھرتی ۱۳۰-۱۲۰ کی رفتار سے جدہ کے مضافات، پھر اندرون سے گزرتی قلب شہر کے ایک شاندار اور اعلیٰ ترین ہوٹل 'میریڈیان' (MERIDIEN) کی بلند ترین (۱۴-۱۵ منزلہ) عمارت کے سامنے رکی، ڈرائیور نے ہوٹل کا بلوریں، دروازہ کھول کر اندر جانے کا اشارہ کیا اور اس کی دسویں منزل کے ایک مستقل کمرہ میں قیام تجویز ہوا جو نہایت آراستہ اور تمام ضروریات ہی نہیں، کمالیات۔ بلکہ خاصی حد تک۔ فضولیات سے بھرا ہوا تھا، رات کے وقت وہاں سے جدہ شہر بڑا حسین نظر آتا تھا، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ چھوٹے بڑے بے شمار ستارے بلکہ آفتاب و ماہتاب (بجائے اوپر کے) نیچے چمک اور دمک رہے ہیں، اور پوری فضا 'نورانی' ہو گئی ہے۔ یوں بھی آج کا جدہ یورپ و امریکہ کے خوبصورت ترین شہروں سے آنکھیں ملاتا اور ان کی ہم سری کرتا ہے، اور بلاشبہ۔ وہاں جیسا کہ جگہ جگہ لکھا ہے۔ وہ "عروس البحر الاحمر" (بحر احمر کی دلہن) ہے۔

حرم محترم کی حاضری:۔ آنے والا دن وہ تھا کہ۔ دن گنے جاتے تھے جس دن کے لئے، یعنی مکہ مکرمہ جانا تھا، جہاں کعبۃ اللہ کی دید سے آنکھیں ٹھنڈی اور بے شمار فیوض و برکات حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ وہاں 'تنگ دامانی' کا گلہ تو ہو سکتا ہے 'عطا' میں کمی کا نہیں، چنانچہ وہ رات کسی طرح انتظار میں کٹی اور خدا خدا کر کے وہ صبح بھی آہی گئی جس پر ہزاروں صبحیں۔ بلکہ پوری زندگی۔ قربان! اور پھر وہی موٹر اور ڈرائیور گناہوں سے بوجھل اسی جسم کو کشاں کشاں لے چلے، اس 'بلد امین' اور 'بیت عتیق' کی طرف جنکی تاثیر ہی۔ رب البیت نے: "امن" (ہر قسم کی سزاؤں۔ جن میں گناہوں کی اُخروی سزاؤں۔ سے حفاظت بھی یقیناً شامل ہے) بتائی ہے پھر وہ ساعت سعید بھی آئی جس کی سعادت افروزی کے بیان کا نہ قلم میں یارا ہے نہ اس کی چنداں ضرورت (بندہ و آقا کے مابین تعلق و ربط کا اظہار یوں بھی مناسب نہیں لگتا)

اجتماع اور اس کی غرض:۔ اس کے بعد وہ دن آیا جس میں وہ 'اجتماع' ہوا جس کے لئے۔ اصلاً۔ یہ سفر ہوا تھا۔ اس کی تفصیل جاننے کے لئے قارئین منتظر ہونگے! تمام باخبر مسلمان۔ کم و بیش۔ یہ جانتے ہیں کہ حج کے موقع پر ۱۰، ۱۱، ۱۲ ذی الحجہ کو۔ ہر سال 'منیٰ' میں لاکھوں جانور ذبح کئے جاتے ہیں، اور یہ بات بھی عموماً معلوم و معروف ہے کہ ان مذبوحہ جانوروں کا گوشت۔ اور دیگر اجزاء۔ اکثر، صرف ضائع ہو جاتے تھے بلکہ ان کی بدبو سے بیماریاں پھیلنے کا خطرہ ہو جاتا تھا جس کے سدباب کے لئے حکومت سعودیہ کو کروڑوں روپے خرچ کرنا پڑتے تھے، اس تکلیف دہ صورتِ حال سے ہر حساس مسلمان فکرمند اور اس کا آرزومند تھا کہ خدا کی یہ عظیم نعمت اور ملت کی کثیر دولت ضائع ہونے کے بجائے صحیح مصرف میں خرچ ہو، اور اس سے ان لاکھوں انسانوں کی ضرورتیں رفع کرنے کا بندوبست کیا جائے جو ساری دنیا میں۔ خود عالم اسلام میں بھی۔ ایک ایک نوالہ اور ایک ایک بوٹی کو ترس رہے ہیں۔ اور بھوک سے تڑپ تڑپ کر جانیں دے رہے ہیں۔ اسی احساس۔ اور درد مند دلوں کی پکار۔ سے بالآخر سعودی حکومت ایسا حل تلاش کرنے پر مجبور۔ اور اس میں فی الجملہ کامیاب۔ ہوئی کہ یہ دولت بڑی حد تک ضائع ہونے سے بچ جائے اس مقصد سے چند سال پہلے حکومت سعودیہ نے 'منیٰ' میں ایک بہت بڑا مذبح۔ مجزرۃ المعیصم۔ بنوایا، جس میں لاکھوں جانور نہ صرف ذبح کئے جاسکتے ہیں بلکہ انھیں۔ پوری طرح بنا کر۔ محفوظ کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ادھر تین سال سے (۱۴۰۳ھ کے حج سے) سعودی حکومت (البنک الاسلامی للتنمیۃ) جدہ کے تعاون سے اجتماعی قربانی، نیز گوشت محفوظ کر کے مختلف ملکوں میں بھیجنے کا نظم کر رہی ہے مگر اس نظام میں حاجی کو۔ عموماً۔ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس کی طرف سے قربانی کا جانور کب ذبح ہوا؟ کیوں کہ حاجی تو بنک کی طرف سے مقررہ 'ٹوکن' خرید کر اور 'بنک' کو اس طرح اپنی طرف سے قربانی کرنے کا وکیل بنا کر فارغ ہو جاتا ہے۔ حالانکہ حج قِران و تمتع کرنے والوں کے لئے حنفی فقہ کی رو سے۔ یہ ضروری ہے کہ ۱۰ ذی الحجہ کی صبح کو پہلے 'رمی' کریں پھر قربانی، اس کے بعد سر کے بال اتروائیں اس ترتیب کی خلاف ورزی پر مزید ایک قربانی۔ دم جنایۃ۔ حدودِ حرم ہی میں کرنا ضروری ہو جاتا ہے، لیکن جب حاجی کو یہ معلوم ہی نہ ہو سکے کہ اس کی طرف سے قربانی کا جانور کب ذبح کیا گیا؟ تو اس کے لئے واجب ترتیب کا ملحوظ رکھنا عملاً ممکن نہیں رہتا تو اس کے۔ ترکِ واجب کے گناہ میں مبتلا ہو جانے۔ پھر اس پر ایک مزید قربانی واجب ہونے کا۔ خطرہ پیدا ہو جاتا ہے، یہ صورت حال حنفی حجاج کے لئے واقعی پریشان کن ہے، چنانچہ حنفی حجاج نے اجتماعی قربانی کے ذمہ دار ادارۃ "البنک الاسلامی للتنمیۃ" جدہ سے بجا طور پر یہ مطالبہ کیا کہ انھیں یہ بتایا جائے کہ ان کی طرف سے جانور کب ذبح کیا گیا؟ لیکن اس اجتماعی نظم میں عملاً یہ ممکن نہیں کہ ہر اک حاجی کو اس کی قربانی کا وقت بتایا جاسکے۔ یہی وہ مسئلہ ہے جسے حل کرنے کے لئے "البنک الاسلامی للتنمیۃ" نے یہ اجتماع کیا تھا اسی وجہ سے اس کے شرکاء میں اکثریت حنفی علماء کی تھی جو مختلف ملکوں۔ مثلاً مصر، شام، ترکی، ہند و پاک بنگلہ دیش سے بلائے گئے تھے۔ ہندوستان سے تنہا راقم الحروف ہی شریک ہوا۔ وہاں پیش کرنے کے لئے مقالہ تیار کر لیا تھا (وقت کی کمی کی وجہ سے جلدی میں تیار کیا گیا تھا، چنانچہ بعض مرحلوں پر ندوی عزیزوں، مولوی حشمت اللہ سلمہ اللہ اور مولوی محمد عثمان سلمہٗ سے تعاون لینا پڑا (فجزاہم اللہ خیر الجزاء) مقالہ خاصہ مفصل ہے۔ جو ندوۃ العلماء سے شائع ہونے والے عربی ماہنامہ "البعث الاسلامی" کی اشاعت ذی قعدہ ۱۴۰۶ھ میں چھپ چکا ہے، اور اس کے اہم حصے اردو ماہنامہ "الفرقان" لکھنؤ کی جون و جولائی ۸۶ء کی مشترک اشاعت میں شائع ہونے کی توقع ہے۔ مزید تفصیل کے طالب اسے ملاحظہ فرمائیں! ۔ راقم نے مقالہ میں فقہی مسالک کا۔ علمی انداز میں۔ ذکر اور ان کے قوت و ضعف کا تجزیہ کرنے کے بعد کچھ عملی تجویزیں۔ اس مشکل کو حل کرنے کے سلسلہ میں۔ پیش کی تھیں۔ مثلاً (۱) قِران و تمتع کی قربانیوں کا سلسلہ ۱۰ ذی الحجہ ظہر یا عصر بعد شروع کیا جائے کیوں کہ عموماً ظہر یا عصر تک حجاج کی خاصی تعداد رمی سے فارغ ہو جاتی ہے، اور بنک کے ذریعہ قربانی کرانے والے حجاج کو بطورِ خاص مطلع کر دیا جائے کہ وہ

اس وقت تک ضرور ہی رمی سے فارغ ہو جائیں۔ (۲) کم سے کم ان حجاج کی طرف سے قربانیاں ظہر یا عصر بعد ہی کی جائیں جو اس کے لیے اصرار کریں کہ ہم ترتیب ملحوظ رکھنا چاہتے ہیں اور یہ جاننے کے لئے کہ یہ قربانی ظہر یا عصر بعد ہی کی جائے گی۔ اس ٹوکن پر مزید ایک علامت کا اضافہ کر دیا جائے جو حجاج کے ہاتھوں فروخت کیا جاتا ہے۔ (اور جس پر قربانی کی مختلف قسموں کے لیے پہلے ہی سے متعدد علامات بنی ہوتی ہیں) برصغیر کے اکثر نمائندوں نے کم و بیش ایسی ہی تجویزیں پیش کیں۔ اور پاکستان کے مولانا مفتی سیاح الدین صاحب نے تو گویا یہی تجویز (اپنے بڑے عالمانہ مقالہ میں) رکھی، راقم نے اس بات پر خاص طور سے زور دیا کہ برصغیر کے حجاج اپنے یہاں کے مشہور دینی و علمی اداروں۔ مثلاً دارالعلوم دیوبند، مظاہر العلوم سہارنپور، دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ اور پاکستان کے دارالعلوم کراچی۔ اور ممتاز دینی شخصیتوں کے فیصلے اور فتوے کے بغیر مطمئن نہ ہوں گے۔ اور حنفی حجاج کی بڑی تعداد برصغیر ہی کی ہوتی ہے اس لیے یہ اجتماع فیصلہ کرتے وقت اس حقیقت کا خاص طور پر لحاظ رکھے ورنہ کوئی فیصلہ یا حل عملاً مفید اور بار آور نہ ہوگا۔

برصغیر کے علماء کیلئے قابل غور مسئلہ:۔ یہ اجتماع دو دن چلا (۸، ۹ اپریل ۸۶ء اور سعودی کلنڈر سے ۲۹، ۳۰ رجب ۱۴۰۶ھ) اس میں ترکی کے ایک نمائندہ نے یہ تجویز پیش کی کہ اس مسئلہ میں (امام ابو حنیفہؒ کے بجائے ان کے مشہور شاگردوں) امام ابو یوسفؒ و محمدؒ کے مسلک پر فتویٰ دیا جائے اور عمل کیا جائے کہ ان دونوں کے نزدیک نہ یہ ترتیب واجب ہے اور نہ اس کے ترک پر مزید قربانی واجب ہوتی ہے۔ بنک کے۔ ذہین اور معاملہ فہم۔ چیرمین نے بس اسی پر زور دیا کہ "حنفی حجاج کو صاحبین (ابو یوسف و محمد) کے قول سے متعارف کیا جائے"۔ اس کا ایک مفہوم یہ نکلتا ہے کہ حنفی علماء و مفتی حضرات۔ بالخصوص ہند و پاک کے مفتی۔ غور و فکر کرنے کے بعد فیصلہ فرمائیں کہ اس عظیم مصلحت۔ لاکھوں جانوروں کو ضیاع سے بچانے اور کروڑوں لوگوں کو ان سے فائدہ پہنچانے کی خاطر۔ صاحبین کے قول پر فتویٰ دینا درست ہوگا یا نہیں؟ امید ہے کہ علمائے کرام اور مفتی حضرات جلد کسی نتیجے پر پہونچ کر اس کا اعلان فرمائیں گے تاکہ ان سے وابستہ حجاج راہ نمائی حاصل کریں اور ذہنی تشویش سے بچیں۔ یہاں یہ وضاحت بھی شاید نامناسب نہیں سمجھی جائے گی کہ حجاج کو اب بھی یہ اختیار حاصل ہے کہ اگر چاہیں تو وہ اپنے طور پر خود قربانی کریں۔ بنک کے ذریعہ نہ کرائیں۔ آزادانہ قربانی کے لئے ابھی منیٰ میں ایک الگ مذبح ہے (جو پہلے سے چلا آرہا ہے) لیکن اپنے طور پر کی جانے والی قربانی کا گوشت۔ اور دیگر اجزاء۔ اکثر ضائع ہو جاتا ہے۔

قابل تعجب واقعہ:۔ مذکورہ اجتماع میں شرکت کے لئے پاکستان سے ایک صاحب (نعیمی) اس گروہ کے بھی آئے تھے، جو اپنے آپ کو "محب رسول" کہتا ہے لیکن انھوں نے اپنے 'محب رسول' ہونے کا ثبوت اس طرح دیا کہ میٹنگ ختم ہونے کے بعد جدہ ہی سے۔ زیارتِ مدینہ منورہ کئے بغیر ہی پاکستان لوٹ گئے۔ یہ بات ان کے ساتھ آئے پاکستانی وفد کے ایک معزز رکن نے بتائی جسے سن کر ہم سب کو تعجب ہوا۔ اتفاق سے برصغیر کے تمام مندوبین ایک ہی جہاز سے مدینہ طیبہ گئے تھے، اس لئے 'نعیمی' صاحب کے پاکستان واپس ہو جانے کا علم ہو گیا۔

مدینہ طیبہ روانگی:۔ اجتماع سے فارغ ہونے کے بعد پہلی فرصت میں حرمین شریفین (میں سے کسی ایک جگہ) جانے کا تقاضہ فطری تھا۔ مگر جدہ کے مخلص اہلِ تعلق۔ جن کی تعداد بحمد اللہ اکابر کی برکت سے (بالخصوص حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم کے فیض سے) اتنی ہے کہ شاید کسی اور جگہ بیرون ملک نہیں ہوگی۔ یہ حضرات اکابر سے تعلق رکھنے والے ان کے ہر نیازمند کے ساتھ تو نہایت کریمانہ برتاؤ کرتے ہیں۔ ان کا اصرار تھا کہ جدہ میں ٹھہر کر ان کی میزبانی سے مشرف ہوا جائے، مگر ہندوستان جیسے دور افتادہ ملک سے صرف چند روز کے لئے حجازِ مقدس جانے والے کسی مسافر کی حرمین شریفین کے علاوہ۔ بلاشدید ضرورت کے۔ کسی اور جگہ ٹھہرنا کہاں گوارہ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ان حضرات کے جذبات کی پوری قدر کرتے ہوئے ان سے معذرت کر کے ایک ہی روز بعد جمعہ کے دن صبح۔ ہوائی جہاز سے (جس کے لئے آمد و رفت کا ٹکٹ 'بنک' نے ہی فراہم کر دیا تھا) مدینہ منورہ چلا گیا جمعہ کی نماز مسجد نبوی میں پڑھنے اور صلوٰۃ و سلام پیش کرنے کی توفیق ملی (والحمد للہ) وہاں جناب سید طارق حسن عسکری کی خصوصی عنایتیں حاصل رہیں، ان کے علاوہ اور بھی بہت سے بزرگوں کی شفقتوں۔ جن میں حضرت مولانا سعید خاں صاحب، مولانا عاشق الٰہی صاحب بلند شہری اور مولانا ہاشم بخاری صاحب خاص طور پر لائق ذکر و شکریہ ہیں۔ اور احباب (جن میں مولوی صلاح الدین سلمہ قاسمی ندوی شامل ہیں) کی عنایتوں سے بہرہ یاب ہونے کا موقع ملا، حضرت مرشدنا و مولانا شیخ الحدیث قدس سرہ کے خدام خاص بھائی ابوالحسن صاحب، صوفی اقبال احمد صاحب اور مولانا حبیب اللہ صاحب کی بھی۔ حضرت ہی کی نسبت و تعلق سے۔ احقر کی طرف توجہات مبذول رہیں۔ فجزاہم اللہ خیراً!

اندازہ ہوا کہ یہ زمانہ حرمین شریفین حاضری کے لئے اس اعتبار سے مناسب ترین زمانوں میں سے ہے کہ ہر مقدس جگہ۔ مثلاً مواجہ شریف، ریاض الجنۃ وغیرہا۔ حاضری تھوڑے سے اہتمام سے حاصل ہو جاتی ہے اور زائر کسی درجہ میں اپنی روحانی پیاس بجھانے کا سامان کر سکتا ہے۔

جدہ کے مخلصین:۔ تقریباً ایک ہفتہ، طیبہ کی پاکیزہ روحانی فضاؤں میں گزار کر پھر۔ جہاز سے ہی۔ جدہ واپسی ہوئی کہ یہاں کے احباب کا تقاضہ اب بھی یہی تھا کہ ان کے خوانِ کرم کی خوشہ چینی کے لئے چند دن اور جدہ میں قیام کیا جائے۔ اس درمیان حسنِ اتفاق سے برادر محترم مولانا مجاہد الاسلام صاحب قاسمی بھی جدہ پہنچ گئے۔ ان کی آمد سے رونق اور بڑھ گئی، خوب مجلسیں جمیں اور جشن کا سا سماں رہا۔ جدہ میں مخلصین کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ سب کا ذکر مستقل مقالہ کا طالب ہے لیکن انھیں صوفی عبد الرحمان صاحب کے فرزندان (بالخصوص بھائی محمد صدیق و بھائی اسماعیل) غلام محمد انجینئر صاحب، مصلح الدین صاحب، محمد مبین قدوائی، مسرت صاحب (خویش ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی) فیضان صاحب اور محمد عرفان لکھنوی صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں اللہ تعالیٰ ان سب کو اپنے شان عالی کے مطابق جزا عطا فرمائے۔

مکہ مکرمہ میں قیام:۔ جدہ میں ایک شب و روز قیام کرنے کے بعد اگلے دن جمعہ کی صبح غلام محمد انجینئر صاحب کی موٹر میں مکہ مکرمہ جانا ہوا اور حرم محترم میں جمعہ پڑھنے کی سعادت نصیب ہوئی، اس کے بعد چند دن مکہ مکرمہ ہی میں، حضرت مولانا محمد شمیم صاحب ناظم مدرسہ صولتیہ کے دولت کدہ پر قیام رہا، مولانا موصوف کی شفقتیں۔ بعض اوقات مادر مشفق کی شفقتوں کی یاد تازہ کر دیتی ہیں اور حج کے زمانہ میں تو مولانا محترم اور مدرسہ صولتیہ، حجاج۔ بالخصوص ہند و پاک کے حجاج کے لئے سراپا خدمت اور خدا کی رحمت کا پیکر بن جاتے ہیں، جن کے سایہ میں غریب الدیار اور پریشان حال حجاج اطمینان کی سانس لیتے اور راحت محسوس کرتے ہیں (اللہ تعالیٰ ابد تک یہ چشمۂ فیض جاری رکھے) اسی لئے برصغیر کے مسلمانوں پر مدرسہ صولتیہ کا یہ حق ہے کہ وہ اس مدرسہ کی ہر طرح خدمت کریں۔

حرم شریف میں عزیز گرامی قدر مولوی علی احمد ندوی سلمہٗ سے ملاقات ہوئی، انھوں نے اپنی گراں قدر کتاب "القواعد الفقہیہ" ہدیہ کی جس کی آج کل علمی حلقوں میں دھوم مچی ہوئی ہے اور جس پر عالمی شہرت کے فقیہ شیخ مصطفیٰ الزرقا شامی نے بیش بہا مقدمہ لکھ کر اس کی قدر و قیمت ہی میں غیر معمولی اضافہ نہیں کیا۔ بلکہ جواں سال مصنف کی محنت و ذہانت کی بھی جی کھول کر داد دی (اللھم زد فزد) یہ عزیز اُن چند گنے چنے افراد میں سے ہیں جو نئے تعلقات و روابط قائم ہونے کے بعد بھی پرانے اہل تعلق کو بھول نہیں جاتے بلکہ قدیم روابط کا پاس و لحاظ رکھتے ہیں۔ شاید ایک وجہ ان کی علمی و دینی ترقی کی یہ بھی ہے، اللہ تعالیٰ ان سے اور زیادہ علم و دین کی خدمت لے اور عمر میں برکت عطا فرمائے۔

مکہ مکرمہ میں مخدومی حضرت مولانا عبد اللہ عباس ندوی کی بھی نوازشیں اس عاجز پر رہیں، چند دن حرم کے نورانی اور روح پرور ماحول میں گزارنے کے بعد باحسرت و یاس۔ جلد پھر حاضری کی تمنا اور دعا کے ساتھ۔ وہاں سے لوٹنا ہوا، اور ایک شب پھر جدہ میں احباب کی عنایتوں کے سایہ میں بسر کر کے بمبئی، دہلی ہوتے ہوئے اگلے دن صبح جہاز سے ہی لکھنؤ پہونچنا ہوا۔ اس طرح ۲۳ اپریل ۸۶ء کو یہ مبارک سفر بخیر و عافیت مکمل ہوا۔ فالحمد للہ اولاً و آخراً وله الشکر، لا احصی ثناء علیک انت کما اثنیت علی نفسک

اللھم صل وسلم علی سیدنا محمد و آلہ و صحبہ اجمعین

دینی مدارس اور عصری تقاضے

عبدالرحمٰن مسلم ندوی

ہم جس دور میں سانس لے رہے ہیں یا اپنے افکار کے اعتبار سے بڑا ہی نرالا ہے، یہ ایسا دور ہے جس میں ہر طرف صنعت وحرفت، سائنس وٹکنالوجی، برقی ایجادات، مشینوں اور مہلک اسلحوں کی ریل پیل ہے، ترقی کی اندھا دھند دوڑ میں ایک ملک دوسرے ملک سے پیچھے رہنے کو اپنے لئے کسر شان سمجھتا ہے ہر طرف رنگ برنگی، جگمگاتی ملمع کی ہوئی مغربی تہذیب وتمدن کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگا ہے، لوگوں نے ہر چمکتی چیز کو سونا جان کر اس کے پیچھے آنکھ بند کرکے دوڑنا شروع کردیا ہے، تہذیب وترقی کے نام پر بے حیائی بدکاری، اور اخلاق سوز حرکت نے آرٹ کی جگہ لے رکھی ہے، حیا سوز حرکتیں گھر گھر جگہ بنا چکی ہیں، تہذیب واخلاقیات اور پرانی مذہبی اقدار اس ترقی یافتہ دور کی بھول بھلیوں میں نہ جانے کہاں کھو گئی ہیں، اس ہما ہمی کے دور میں اسلامی تہذیب کا رواج اور چلن تو کجا، خود مسلمان تہذیب نو کی نیرنگی سے ایسا سراسیمہ ہو گیا ہے کہ اب اسلامی تشخص کا باقی رہنا بھی مشکوک نظر آتا ہے۔

ایک سنہری دور وہ بھی گذرا ہے جس کے صرف تذکرے سے بھی ہماری علمی محفلیں منور ہو جاتی ہیں جسے خانقاہی دور سے یاد کیا جاتا ہے، وہ نورانی خانقاہیں جہاں سے ایسے افراد معرض وجود میں آتے تھے جو انسانوں کی کایا پلٹ دیتے تھے جو گوشۂ تنہائی میں رہکر بھی سلطنت وقت پر حاوی اور اثر انداز تھے جو نبض شناس گردش دوراں تھے، بڑے بڑے امرار وسلاطین ان کی چوکھٹ پر سر نیاز خم کرنے کو باعث سعادت سمجھتے تھے، اہل دول ان کے مشوروں کو کامیابی کی کلید سمجھتے تھے، اہل سیاست انگلی پکڑ کر ان سے چلنا سیکھتے تھے، دنیا کی طاقتوں سے خوفزدہ ہونے یا مصلحت کی آڑ میں چھپنے کی بجائے وہ باطل قوتوں سے نبرد آزما ہوتے تھے اور اہل باطل کو حق کی طاقت کے سامنے سرنگوں ہونے پر مجبور کرتے تھے، وہ کسی کی دولت، امارت یا وجاہت سے متاثر نہیں ہوتے تھے، زمانہ کی گردش سے حیران ہونے کے بجائے وہ زمانے کے دھارے کو موڑنے کی طاقت رکھتے تھے اور مومن کی اس شان خسروانہ کی مکمل تفسیر تھے کہ ؎

ہم سے زمانہ خود ہے زمانے سے ہم نہیں

لیکن ؎

سدا دور دورہ دکھاتا نہیں

گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

حکومتیں بدل گئیں، افراد بدل گئے، حالات بدل گئے اور خانقاہی دور بھی لد چکا، نیا زمانہ ہے، نئی نسل ہے، نئے تقاضے ہیں، ہر چیز نئی تہذیب سے مزین ہے جس کے اچھے یا برے عواقب ہماری نظروں کے سامنے ہیں، اب نہ ان خانقاہوں کا وجود ہے نہ ان ہستیوں کا جن کے دم سے چمنستان اسلام میں بہار، ایمان میں تازگی نگاہوں میں روشنی اور دنیا وآخرت میں کامرانی کی منزل سے ہمکنار ہوتی تھی۔ ؎

یارب وہ ہستیاں بھی کس دیس بستیاں ہیں

اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

خانقاہی نظام ہی کے قائم مقام اب دینی مدارس بن گئے ہیں لیکن وائے رے حق نیابت،

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

یہاں تو یہ عالم ہے کہ دینی مدارس والوں کو عصری تقاضوں سے روشناس کرانا ضروری سمجھا جا رہا ہے علمار جو ورثۃ الانبیار ہیں جن کے ہاتھوں میں امت کی زمام ہے عصری تقاضوں سے کنارہ کشی کرکے مدرسوں کی چہار دیواری میں ہم چو من دیگرے نیست کے زعم میں بغلیں بجاتے رہیں گے، تو یقیناً امت محمدی کسی شتر بے مہار کی طرح باطل ازموں کے پیچھے دوڑے گی اور نہ جانے کس کس ازم کے علمبردار کو اپنا نجات دہندہ سمجھ بیٹھے گی، موجودہ زمانہ کے حالات اور تقاضوں کا بہ غائر جائزہ لینے کے اجد یہ بات کسی بھی طرح عقل میں نہیں آتی کہ اہل مدارس خاموش تماشائی بنے بیٹھے رہیں اور اپنی ذمہ داری سے چشم پوشی کریں، اگر وہ اس جرم کے مرتکب ہوتے ہیں تو وقت کا تیز بہتا ہوا دھارا اور زمانہ کے طوفان، تھپیڑے اور انقلابات انہیں فراموش کرنے اور ان کی ساکھ کو نیست ونابود کرنے میں پورا زور صرف کردیں گے۔

پوری دنیا کو اس وقت صحیح رہبری اور قیادت کی ضرورت ہے ان کے مسائل کا حل اسلام پیش کرتا ہے، ایسے وقت میں اگر دینی مدارس کے علمار اپنے فرض منصبی سے کوتاہی برتتے ہیں تو اس کا لازمی اثر نہ صرف عام اقوام عالم پر ہوگا بلکہ خود امت مسلمہ بھی اس سے بری طرح متاثر ہوگی۔

آج جس جمہوریت نواز ملک میں ہم آباد ہیں اور جہاں جمہوریت اور سیکولرازم کا دور دورہ ہے سیکولرازم کے بہانے مسلمانوں کی انفرادیت تشخص اور امتیاز کو ملیامیٹ کرنے کی بھرپور کوششیں کی جارہی ہیں اور ہمارا یہ حال ہے کہ ڈیڑھ اینٹ کی الگ الگ مسجدیں کھڑی کرنے میں لگے ہوئے ہیں اور خوش ہیں۔ ؎

ملا کو اجازت ہے اذاں کی جو ہند میں

ناداں سمجھتا ہے کہ اسلام ہے زندہ

اس سیکولرازم کی دعویدار حکومت کی جانب سے پیش کئے جانے والے سرکاری اسکولوں کے مسلم دشمن نصاب تعلیم کو دیکھنے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ اس نصاب تعلیم کے ذریعہ پڑھنے والا کوئی بھی مسلمان بچہ مسلمان نہیں رہ سکتا، لیکن افسوس ہے کہ امت کے زخموں پر مرہم رکھنے کے لئے ہمارے پاس وقت نہیں، قوم کی آواز میں آواز ملا کر اور کندھے سے کندھا لگا کر احتجاج کرنے اور مسائل کے لئے لڑنے کو ہم شان علمار کے خلاف سمجھتے ہیں، جب کہ یہ حقیقت ہے کہ اسلاف علمار وسلف صالحین راتوں کے زاہد اور دن کے مجاہد تھے، آج اگر ہم عامۃ المسلمین سے کچھ ربط بھی رکھتے ہیں تو ایسا جس سے ان کے مفاد سے زیادہ ہمارے اپنے ذاتی مفاد حل ہوتے ہیں، ان کے مسائل کی طرف توجہ دینے سے ہم یہ کہہ کر گریز کرتے ہیں اور مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہمیں ان سے کیا واسطہ یہ کام تو خالص سیاسی لیڈروں کے کرنے کا ہے، جن امور میں علمار کی رہبری درکار تھی وہ سب سیاسی رہنماؤں کے سر تھوپ دیئے گئے ہیں اور علمار ان معاملات کو سیاسی معاملات کا لیبل دے کر سیاست سے کنارہ کشی میں اپنی عافیت اور اپنے علم اور زہد وورع کی تکمیل سمجھتے ہیں، نتیجہ یہ ہوا کہ ایسے عوامی نمائندے میدان سیاست میں اچھل کود کرنے لگے جن کی وجہ سے سیاست گندی اور اچھوت تصور کرلی گئی، اور یہ تصور عام ہو گیا کہ جو بھی اس سے قریب ہوگا اس کے گندے چھینٹوں سے اس کا تن من داغدار ہوگا اور یہ حقیقت بھی ناقابل تردید ہے کہ ؎

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اہل مدارس میں سے کسی کی بھی اس چنگیزی سے مقابلہ کرنے کی ہمت نہ ہوئی بعض جری اور حوصلہ مند آگے بڑھتے بھی ہیں تو وہ ایسی رسہ کشی کا شکار ہو جاتے ہیں، آج شدت کے ساتھ ہم نے بہت سے دینی مدارس کے قیام کی ضرورت کو تو محسوس کیا ہے، ہر کہ آمد عمارت نو ساخت کا معمول تو نظر آتا ہے، عوام کی اصلاح کے لئے لچھے دار تقریریں کرکے اور پر جوش تحریریں لکھ کر داد وتحسین تو حاصل کرلی ہے، لیکن اگر نہیں کیا ہے تو بس صرف یہ کہ ملت کے منتشر شیرازہ کو یکجا کرنے اور انہیں دین وحدت کے جھنڈے تلے جمع کرنے کی فکر میں سر جوڑ کر نہیں بیٹھے اور یہ فکر وکوشش ہو کیونکر جب کہ آپسی کی چپقلش اور باہم عناد چشمک امت کی افادیت کے لئے سوچنے اور کچھ کر گذرنے کا ہمیں وقت ہی کب دیتی ہے، امت کے کسی اصلاحی پہلو پر کام کرنے کے لئے جوش سے بھرے چند افراد اگر آگے بڑھتے بھی ہیں تو ہماری سرد مہری ان کے جوش ایمانی پر پانی پھیر دیتی ہے اور علمار کے آپسی تنازعہ میں امت کی مثال دو ملاؤں میں مرغی حرام کی سی ہو جاتی ہے، نتیجہ یہ ہے کہ آج ایک عام سیدھا سادہ سا مسلمان عالم دین کو صرف مسجد کے امام مدرسہ کے مدرس، چندہ وصول کرنے والے یا زیادہ سے زیادہ ایک واعظ کی حیثیت سے زیادہ نہیں سمجھتا، اہل علم کی اس کے ذہن میں بیٹھی ہوئی تصویر اور اس کے اپنے تصور کی بنار پر وہ کل دین کی اساس انہی چند باتوں کو سمجھ بیٹھا ہے جن سے اسے واسطہ پڑتا ہے، یعنی نماز پڑھنا، دین کی اشاعت کے نام پر چندہ دینا اور وعظ سننا، اس سے آگے کے سارے کاموں کے لئے وہ کسی سوشل ورکر یا سرکاری و نیم سرکاری تنظیم کے پیچھے پیچھے جوتیاں گھستا ہے۔

کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ

اس حدیث نبوی کے پیش نظر عام آدمی تو زیادہ سے زیادہ اپنے اہل وعیال کے بارے میں مسئول وماخوذ ہے، لیکن طبقہ علمار پر پوری امت اور پورے معاشرہ کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، زمانے کی رفتار کو دیکھتے ہوئے اور اس کے تقاضوں کی رعایت کرتے ہوئے اہل مدارس کو بہت تیزی سے اپنی طرز روش میں تبدیلی لانے کی ضرورت ہے انہیں یہ ثابت کرنا ہوگا کہ اہل مدارس نہ صرف پوری امت اسلامیہ کی بلکہ جمیع اقوام عالم کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے کر قیادت کے فرائض انجام دے سکتے ہیں، انہیں اتنا پاور فل بننا ہوگا کہ لوگ اپنے مسائل کے حل کے لئے خود ان سے رجوع ہوں ان کی آواز صدا بہ صحرا نہ ہو........ بلکہ اتنی پر اثر ہو کہ ان کی ایک صدا پر ہر طرف سے لبیک کی صدائیں بلند ہوں اور اسلام دشمن طاقتیں اور حکومت کے ایوانوں تک لرز اٹھیں انہیں یہ ثابت کرنا ہوگا کہ دینی مدارس صرف قال اللہ اور قال الرسول کی زبانی تعلیم کا نام نہیں بلکہ مسلمانوں کو متحد کرنے اور ان میں جوش ایمانی پیدا کرنے اور انہیں دین اسلام کے لئے جان ومال کی قربانی کا خوگر بنانے کی ایک مکمل تحریک ہیں اپنے اندر ایسی بیداری پیدا کرنے اور ضرورت ہے کہ عصری تقاضوں سے بے خبر رہنے کے بجائے قبل از وقت ان کی تکمیل کی جا سکے۔

مُطالعہ کی میز پر

(تبصرے کے لیے دو نسخے ضروری ہیں)

نام کتاب:۔ اہل سنت والجماعت کی حقیقت
مصنف:۔ مولانا حافظ سید محمد علی قادری نقشبندی
صفحات:۔ ۶۰
قیمت پانچ روپئے
ملنے کا پتہ:۔ بیگ ولا، ۳۷۷/۱ — ۱۶ اعظم پورہ۔ حیدر آباد دکن

پیش نظر کتابچہ اگرچہ صرف ساٹھ صفحہ پر مشتمل ہے لیکن شرک وبدعات کی رد میں لکھی جانے والی کئی ضخیم کتابوں پر بھاری ہے اسکی بنیادی وجہ ایک تو یہ ہے کہ لکھنے والا گھر کا بھیدی اور اس راہ کا مسافر رہ چکا ہے دوسرے یہ کہ ثقیل علمی اصطلاحات کے بجائے مصنف نے دلکش اور سادہ علمی اسلوب میں دو دو چار کی طرح شرک وبدعات کی گمراہی وحرمت کو اسطرح ثابت کردیا ہے کہ معمولی عقل وفہم کا انسان بھی انکو تسلیم کرنے پر اپنے کو آمادہ پانے پر مجبور پائے گا، تیسری خصوصیت جس نے اس کتاب میں قوت وتاثیر پیدا کردی ہے وہ لکھنے والے کی دردمندی اخلاص سوز دروں اور ملت کی زبوں حالی پر کڑھن اور گھٹن ہے۔

مصنف نے سب سے پہلے اہل سنت والجماعت کی صحیح تعریف قرآن وحدیث سے متعین کرکے اختلاف صحابہ جیسے نازک اور حساس مسئلہ پر بحث کی ہے اور اعتدال کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا، اس بحث میں موصوف نے ان لوگوں کی قلعی کھول دی ہے جو شرک وبدعات میں ملوث ہیں اور بڑی بے حیائی سے دعویٰ کرتے ہیں کہ وہی اہل سنت والجماعت کے عقیدے پر ہیں۔ مصنف نے سوال کیا ہے کہ کیا اہل سنت کا شعار یہ ہے کہ عمر بھر نماز نہ پڑھیں اور فاتحہ کی کوئی تاریخ بغیر فاتحہ کے نہ ٹلے۔ اور فاتحہ بھی من گھڑت، رمضان جیسا اہم اور مقدس مہینہ بغیر روزے کے گزر جائے لیکن اسکا کوئی اہتمام نہ ہو لیکن ربیع الاول ربیع الثانی اور رجب کی بڑی فکر لاحق ہوگی بڑی اہمیت کے ساتھ ان مہینوں میں فاتحہ اور نیاز کا اہتمام کیا جاتا ہے خانہ کعبہ جسکی طرف رخ کرکے پانچ وقت نماز پڑھنا فرض ہے اس کا کوئی شوق ہی نہیں لیکن اجمیر اور بغداد پر جی جان سے نثار ہوں گے۔ اللہ کا ذکر کیا جائے توحید کا بیان ہو تو طبیعت پر گرانی ہوگی اور منھ کا مزہ کڑوا ہو جائیگا لیکن "ہزہ بھوڑے کے شہزادے اور اجمیر کے بانکے سنوریا" کے نام پر جھوم جھوم اٹھیں گے۔

شرک وبدعات کی تردید کے ساتھ یہ کتاب ان صلح پسند علمار کے لئے بھی دعوت فکر ہے جو شرک وبدعات پر گرفت اور تنقید کو پسند نہیں کرتے بلکہ انکا رویہ ہوتا ہے کہ اللہ تو راضی ہے ہی اب شیطان سے لڑائی مول لینا کیا ضروری ہے۔

ضرورت ہے کہ اصلاح معاشرہ کے جس پروگرام کو آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ آگے بڑھا رہا ہے وہ شرک وبدعات کے خلاف ایک طوفانی مہم بھی پورے ملک میں چلائے کہ یہی مسلم معاشرہ کی اصل بیماری ہے۔

(نذر الحفیظ ندوی)

نام کتاب:۔ روح اخلاق
مصنف:۔ جناب ریاض الدین احمد صاحب
پبلشر:۔ دینی تعلیمی کونسل یو۔پی
۹۹۔ گوئن روڈ لکھنؤ
صفحات:۔ ۱۷۰
قیمت:۔ مبلغ سولہ روپیہ

اس پر آشوب وپرفتن دور میں اخلاق کو بگاڑنے والی اور فحش کتابیں آسانی سے دستیاب ہو سکتی ہیں، لوگ ایسی کتابوں میں دلچسپی بھی لیتے ہیں، اگر کسی ناول کے پڑھنے والے کو اصلاحی کتاب پڑھنے کے لئے دیدی جائے تو وہ اس کو اتنی دلچسپی سے نہیں پڑھے گا جتنا کہ وہ مزہ لے کر کوئی ناول پڑھتا ہے، اس دور میں ناول یا افسانے کے رائیٹر تو بہت ہیں مگر اخلاق کو سنوارنے والے اصلاحی کتابیں لکھنے والے قلمکار بہت کم ہیں، مگر خدا کا ہزار ہا شکر ہے کہ آج بھی علمار کرام لوگوں کے اخلاق بنانے اور سنوارنے کے لئے اسلاف کے کارنامے دلچسپ انداز میں لکھتے ہیں کہ جس کو پڑھنے والے کے ذہن میں واقعات نقش ہو جاتے ہیں، انہی اخلاق کو سنوارنے والی کتابوں میں "روح اخلاق" جسکو ریاض الدین احمد صاحب جنرل سکریٹری دینی تعلیمی کونسل یو۔پی نے قلمبند کیا ہے، ایک ممتاز حیثیت کی حامل کتاب ہے، یہ کتاب مکاتب کے طلبار اور ہمارے معاشرہ کے وہ نوجوان جو اسکول وکالجوں میں زیر تعلیم ہیں کے لئے بہت مفید ہے، کتاب ہذا میں مؤلف نے اسلاف کے کارنامے، علمار کے واقعات کو سادہ سلیس انداز میں قلمبند کیا ہے، عبارت پیچیدہ نہیں ہے، سادہ وآسان عبارت ہے، مثلاً مضمون ہے "موت کی موت" "خدا کی قسم" اور "پڑوسی" یہ سب ایسے مضامین ہیں جو کہ ہمارے معاشرہ میں اکثر ایسے واقعات پیش آتے رہتے ہیں کبھی کسی کا اپنے پڑوسی سے کسی بات پر جھگڑا ہو گیا تو کبھی لوگ اپنی بات پر یقین دلانے کے لئے قسمیں کھاتے ہیں۔ اسکے علاوہ بھی بہت سے مضامین ہیں جنھیں ...... صحابہ کرام کے واقعات کو مؤلف نے اچھوتے انداز میں پیش کیا ہے موجودہ دور میں جبکہ ہر انسان اپنے کاروبار وتجارت میں منہمک ہے اسکے پاس اتنا موقع نہیں ہے کہ تھوڑا سا قیمتی وقت نکال کر صحابہ کرام وعلمار کرام کے واقعات کا مطالعہ کرے کتاب "روح اخلاق" کے مطالعہ کے لئے اگر روزانہ کوئی شخص صرف دس منٹ وقت نکال کر ایک مضمون پڑھ لیا کرے تو اس کو کتنی قیمتی باتیں معلوم ہو جائیں گی اسکا اندازہ کرنا مشکل ہے، صرف ایک مضمون فکر وقلب کی گہرائی کے ساتھ پڑھا جائے تو ہماری آئندہ کی زندگی سنور سکتی ہے ......

نام کتاب:۔ ماہنامہ ذکریٰ "مجاہدین افغانستان نمبر"
صفحات:۔ ۲۱۲
پتہ:۔ ماہنامہ ذکریٰ۔ گھیر سیف الدین خاں رام پور ۲۴۴۹۰۱
قیمت دس روپیے

ماہنامہ ذکریٰ ایک اچھا دینی واصلاحی ڈائجسٹ ہے جو اپنے مفید مضامین کے سبب اپنے قارئین کا وسیع حلقہ رکھتا ہے اس نے جرأت ایمانی اور غیرت دینی وملی کا ثبوت دیتے ہوئے مجاہدین افغانستان کو خراج عقیدت ومحبت پیش کرنے اور اردو دنیا کو جہاد افغانستان کی حقیقت واہمیت بتانے کے لئے یہ دلکش، معلومات افزا اور ایمان پرور نمبر شائع کیا ہے جو صوری ومعنوی ہر لحاظ سے لائق مطالعہ واستفادہ ہے اور ہر غیرت مند مسلمان کے لیے ایک قیمتی تحفہ ومبارک ہدیہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس دینی وملی خدمت پر رسالہ کے فاضل مدیر مولانا محمد یوسف اصلاحی ہر طرح مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے عالم اسلام کے ایک اہم مسئلے کی طرف توجہ کی اور افغانی المیے کے کچھ پہلوؤں سے دنیا کو موثر طور پر واقف کرانے میں کامیاب ہوئے۔ جہاں تک نمبر کے مشمولات کا تعلق ہے اسکے انتخاب میں بھی مدیر محترم کا ادارتی وانتخابی سلیقہ نمایاں ہے اور نظم ونثر میں جہاد افغانستان کے ایمان پرور اور یقین آفریں احوال ووقائع کو دلکش پیرائے میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

خود مدیر محترم کے اداریوں میں جہاد کی اہمیت اور افغانی جد وجہد کی قدر وقیمت بڑے مناسب انداز میں آگئی ہے۔ نمبر کے اہم مضامین میں حزب اسلامی کے قائد انجینئر گلبدین حکمت یار مدظلہٗ کا انٹرویو سر فہرست ہے جو ہم نے سرخ سامراج کے ناقابل شکست ہونے کے تصور کو پاش پاش کردیا ہے کے عنوان سے شائع ہوا ہے، پاکستان کے ممتاز صحافیوں میں جناب محمد صلاح الدین اور جناب رفیق افغان نے جہاد افغانستان کے چشم دید مناظر کو ایسے عمدہ پیرائے میں سپرد قلم کیا ہے کہ قاری کے چشم تصور کے سامنے بھی وہ ایمان افروز مناظر محسوس ہونے لگتے ہیں اور خبر، نظر بن جاتی ہے۔ شفیق اعجاز احمد خاں (دسری نگر) نے افغانی خواتین کے اسلامی جذبے کے موثر واقعات سنائے ہیں جو پاکستانی رسائل جہاد افغانستان کی قلمی خدمت کر رہے ہیں، ان میں ہجرت، "آئین" "تکبیر" نمایاں ہیں اس نمبر میں ان کے مضامین بھی نقل کیے گئے ہیں۔

نظموں میں سید انوار ظہوری کی نظم "کابل سے کربلا تک" "سرلے کے ہتھیلی پر" (صباحسنی) "افغان غدامت کے ایماں کی ادا دیکھ" (کمال سالار پوری) "اے ملت افغان" (ابن طارق خاکی) اور فضلی علیم ناصری، عروج قادری مرحوم مولانا ظفر علی خاں اور نعیم صدیقی کی نظمیں بھی بہت متاثر کرتی ہیں۔ غرض مجاہدین افغانستان کے ذکر جمیل کی برکت سے یہ نمبر سراپا تبرک بن گیا ہے جس سے ہر مسلمان کو فیض یاب ہونا چاہیے۔

(شمس تبریز خاں)